جلد ۸۶ جنوری ۱۹۵۰ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۶ | جنوری ۱۹۷۷ء مطابق محرم ۱۳۹۷ھ | عدد ۵۰

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ــــــــ ۴۱۱۰۱۶ ــــــــ ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ہمارے ملک کے حکمرانوں کی یہ ریت سی بن گئی ہے کہ دنیائے عمل میں خواہ انہیں اسلام سے کتنی ہی کد ہو لیکن زبان کی حد تک خصوصاً جب انہیں عوام کے جذبات سے کھیلنا مقصود ہو، اسلام کے بڑے شیدائی بنتے ہیں۔ اسلام کی حیثیت اُن کے نزدیک ایک دلفریب نعرے کی سی ہے جسے بلند کر کے وہ عوام میں مقبولیت حاصل کرتے ہیں اور پھر اُنہیں فریب دے کر تختِ اقتدار پر فائز ہوتے ہیں۔ اِس مقدس نام کی برکت سے لوگوں کو بیوقوف بنائے رکھتے ہیں اور جب اُن کی بداعمالیوں اور عوامی احساسات و مفادات کے خلاف اقدامات کی وجہ سے اُن کے اقتدار کا سنگھاسن ڈولنے لگتا ہے تو اسلام کا وظیفہ پڑھ کر اپنے متزلزل اقتدار کو سہارا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام اگر محض کلمۂ ورد ہوتا تو ممکن تھا ان لوگوں کی دین پسندی کا بھرم کافی مدت تک قائم رہتا لیکن چونکہ یہ ایک مخصوص اندازِ فکر اور اسلوبِ حیات کا نام ہے جس کے پرتو زندگی کے ہر گوشے میں دیکھے جا سکتے ہیں، اِس لیے اسلام سے عقیدت و محبت کی حقیقت جلد ہی عوام کے سامنے کھُل جاتی ہے۔ وہ حیران ہو کر پوچھتے ہیں اسلام سے محبت کا یہ کونسا انداز ہے کہ دینِ حق کو دل و جان سے چاہنے والوں کی عملی زندگی میں اِس کی کوئی جھلک نظر نہ آتی ہو، بلکہ بغاوت کا رنگ نمایاں ہو اور لوگوں کے معاملات کے نگران ہونے کی حیثیت سے اللہ کا دین اُن پر جو نازک ذمہ داریاں عائد کرتا ہے اُن سے نہ صرف جان بوجھ کر اغماض برتا جائے بلکہ ہر اُس بُرائی کی سرکاری سطح اور قومی ذرائع سے حوصلہ افزائی کی جائے جو اسلام کی عین ضد ہے۔ عوام کے اِس حسرتناک مشاہدے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کے دل میں حکمرانوں کے قول و قرار کا کوئی اعتبار باقی نہیں رہتا اور وہ اِس نہج پر سوچنے لگتے ہیں کہ اگر یہ لوگ دین جیسی مقدس متاع کے بارے میں، جس پر اُن کی دُنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کا دار و مدار ہے، سنجیدہ نہیں تو اور

کس چیز کے بارے میں مخلص ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ عوام سے اُن کی محبت، اُن کی فلاح و بہبود کے لیے اُن کی فکرمندی اور قوم اور ملک کی بہتری کے لیے اُن کے دعاوی بھی محض فریب کاریاں ہیں جن کے ذریعے وہ پیرِ تسمہ پا بن کر تا دیر اُن کی گردنوں پر مسلط رہنا چاہتے ہیں۔

اسلام نے جس طرح فرد کی اسلام سے محبت کی جانچ کے لیے کچھ پیمانے مقرر کیے ہیں، اسی طرح حکمرانوں کی اسلام سے وابستگی کا اندازہ کرنے کے لیے چند معیارات قائم کیے ہیں، جن کی مدد سے ہر فرد اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ مسندِ اقتدار پر فائز لوگوں کا دینِ حق سے تعلق کس درجہ کا ہے۔ ان معیارات سے تو سبھی مسلمان، حاکم و محکوم، واقف ہیں۔ ان صفحات میں ہم اُنھیں ایک ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ ملک کے فرمانرواؤں کو یہ معلوم ہو سکے کہ جس اسلام کی خدمت کا وہ صبح و شام ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اُس کا اُن سے کم از کم مطالبہ کیا ہے۔

اسلام مسلمان حکمرانوں سے پہلا مطالبہ یہ کرتا ہے کہ وہ اپنی قلمرو میں نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور اُن بھلائیوں کو فروغ دیں جنھیں اسلام پروان چڑھانا چاہتا ہے اور ان بُرائیوں کا استیصال کریں جنھیں اسلام دنیا سے مٹانے کا عزم رکھتا ہے۔ اِس حقیقت کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط	(یہ مسلمان) وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

(الحج ۲۲:۴۱)

اسلام نے مسلم عوام کا اپنے فرمانرواؤں کے ساتھ سمع و طاعت کا تعلق محولہ بالا فرائض کے ادا کرنے کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بُرے حکمرانوں کی چند خصوصیات بیان فرمائیں، اِس پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم نے بارگاہِ اقدس میں گزارش کی: کیا ہم اُن کا تختہ نہ اُلٹ دیں! آپ نے ارشاد فرمایا: نہیں، جب تک وہ تمھارے درمیان نماز قائم کریں، نہیں جب

تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کریں۔ (مسلم، کتاب الامارۃ)

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا بھی اسی طرح روایت کرتی ہیں کہ نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تم پر ایسے حکمران ہوں گے جن کے بعض کام اچھے اور بعض بُرے ہوں گے۔ جس نے (بُرے کاموں میں تعاون کرنے) سے انکار کیا وہ بری الذمہ ہوگیا اور جس نے انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا وہ محفوظ ہوگیا اور جو اُن پر راضی ہوگیا اور (اُن ظالم فرمانرواؤں) کی اطاعت کرنے لگا تو وہ اُن کے گناہ و وبال میں شریک ہوا۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی: پھر کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز پڑھیں، نہیں، جب تک وہ نماز پڑھیں۔ (مسلم)

قرآن و سنت نے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد ایک مسلمان حاکم پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ معاشرے میں ظلم و تشدد کی ہر صورت کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام ہے۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو اسلامی ریاست کے اوّلین سربراہ بھی تھے، کی وساطت سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عدل و انصاف کے قیام کی ان الفاظ میں ہدایت کی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸)	(مسلمانو!) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

دوسرے مقام پر یوں فرمایا گیا ہے۔

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (المائدہ: ۴۲)	اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

عدل کیا ہے؟ حقدار کو اُس کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا اور جس فرد یا گروہ نے جبر و تشدد

یا مکر و فریب سے حقدار کو اس کے جائز حق سے محروم کر رکھا ہے اُسے اُس کی ظالمانہ کارروائی کی سزا دینا۔ خلیفۂ اوّل سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بار خلافت اُٹھاتے ہوئے اپنے پہلے خطبہ میں قیامِ عدل کے بارے میں اپنی اِس نازک ذمّہ داری کو اِس طرح بیان فرمایا:

ایھا الناس فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقوّمونی۔ الصدق امانۃٌ والکذب خیانۃٌ والضعیف منکم قوی عندی حتی اُزیح علتہ والقوی فیکم ضعیف حتی اخذ منہ الحق ان شاء اللہ	لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ پس اگر میں اچھا کام کروں تو میرے ساتھ تعاون کرو اور بُرا کام کروں تو مجھے راہ راست پر لاؤ۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں سے کمزور میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے اس کا دکھ دُور نہ کردوں اور تم میں سے قوی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اللہ کی مرضی سے اُس سے وہ حق نہ لے لوں (جو اُس نے قوت کے بل بوتے پر دبا رکھا ہے)۔ (البدایہ والنہایہ)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عادل حکمران کی جن زوردار الفاظ میں فضیلت بیان فرمائی ہے اور اس کے مقابلے میں ظالم اور خائن حکمران کو جس ذلت آمیز عذاب کی وعید سُنائی ہے اُس سے اِس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عدل وانصاف اور حق رسی اللہ کی نگاہ میں کس قدر غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اور ظلم اور ناانصافی کس قدر مذموم کارروائیاں ہیں۔ یوں تو اِس باب میں لاتعداد احادیث ملتی ہیں، لیکن ہم ذیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف چند فرمودات درج کرتے ہیں:

ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں جو شخص سب سے زیادہ محبوب اور جسے اُس ذاتِ برحق کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوگا وہ امامِ عادل کی ذات ہوگی۔ اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے زیادہ مبغوض اور سخت ترین سزا کا مستوجب — اور ایک روایت کے مطابق باری تعالیٰ سے سب سے زیادہ دُور — ظالم امام ہوگا۔" (ترمذی)

اِسی ضمن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک روایت ہے کہ نبیٔ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا:

کیا تمہیں معلوم ہے کہ قیامت کے روز ربّ العزت کے سایہ میں کون لوگ سب سے پہلے پناہ لیں گے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی: اللہ اور اُس کے رسولؐ ہی سب سے بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا:

یہ وہ لوگ ہوں گے کہ جب اُن کے سامنے حق پیش کیا جائے تو وہ قبول کرلیں۔ جب اُن کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے تو وہ بخوشی خرچ کریں اور لوگوں کے درمیان اِس طرح انصاف کریں جیسے وہ اپنی جانوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ (مشکوٰۃ۔ کتاب الامارۃ)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بندگانِ خدا میں سے قیامت کے روز اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ صاحبِ فضیلت عادل اور مشفق امام ہوگا۔ اور روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بدترین شخص ظالم اور سخت گیر امام ہوگا۔ (مشکوٰۃ)

قرآن و سنت میں عدل کی اصطلاح اپنے وسیع ترین معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ خداوند تعالیٰ کے نزدیک عدل کا منشا اُس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک کسی معاشرے کی پوری فضا اُس کے خیر و برکت سے معمور نہیں ہوجاتی۔ جب تک ہر فرد کا دل، خواہ اُس کا تعلق کسی شعبۂ حیات سے ہو، اس بات پر مطمئن نہ ہوجائے کہ اُسے اُس کے جائز حق سے کوئی بھی محروم نہیں کرسکتا اور جس چیز کا وہ حقدار نہیں وہ اُسے کسی طور بھی میسّر نہیں آسکتی، اُس وقت تک اُس میں خوشدلی کے ساتھ معاشرے کے مطالبات پورے کرنے کی اُمنگ پیدا نہیں ہوسکتی۔ معاشرے کے مختلف طبقات کے اندر توازن و اعتدال پیدا کرنے کے لیے اور اُن کے حقوق کے منصفانہ تعین اور تحفظ کے لیے رعایا کو اِس بات کا پورا پورا اطمینان ہونا چاہیے کہ جن افراد کے ہاتھ میں ان کی زمامِ کار ہے وہ انتہائی بے لوث، منصف مزاج، خدا ترس اور زیرک لوگ ہیں اور اُن میں یہ صلاحیت اور قوت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ ہر ذی رُوح جو اُن کی قلمرو میں آباد ہے اُس کے حقوق کا تحفظ کرسکیں اور اگر کوئی سرپھرا انہیں پامال کرنے کی جرأت کرے تو اُسے اِس بے جا جسارت کی عبرتناک سزا بھی دلواسکیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان حکمرانوں کو اس امر کی بھی تاکید کی ہے کہ وہ عوام کے ساتھ نرمی اور شفقت کا وہ رویہ اختیار کریں جو ایک نیک نفس باپ اپنی اولاد کے معاملے میں کرتا ہے۔ انہیں لوگوں کے لیے دہشت کی قوت بننے کے بجائے رحمت کی نوید بننا چاہیے تاکہ عوام اُن کے زیر سایہ آکر اس طرح آرام اور سکون محسوس کریں جیسے ایک پریشان حال فرزند مشفق باپ کی آغوش میں آکر محسوس کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کی اجتماعی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، فَالْإِمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْؤُولَةٌ عَنْهُمْ۔	خبردار! تم میں سے ہر شخص رعیت کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ حکمران جو عوام کا نگہبان ہے وہ رعیت کے معاملے میں جواب دہ ہے۔ اسی طرح ایک شخص اپنے اہل خانہ کا نگران ہے اور وہ اُن کے بارے میں جواب دہ ہے۔ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد کی نگران ہے اور وہ اُن کے متعلق جواب دہ ہے۔

(مسلم۔ کتاب الامارۃ)

اِس حدیث میں آپؐ نے ایک مسلمان حکمران کو اس کی نازک ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے اُسے یہ بات بھی ذہن نشین کرائی ہے کہ اُس کا اپنی رعایا کے ساتھ سراپا دلسوزی، ایثار اور خیر خواہی کا تعلق ہونا چاہیے۔ جس طرح ماں باپ کو ہر وقت اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کی فکر دامن گیر رہتی ہے اُسی طرح مسلم حکمران کو اپنی رعایا کی بھلائی کے لیے ہر آن آرزو مند اور ہمت آزما رہنا چاہیے۔

پھر گلہ بانی کے استعارہ میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی مضمر ہے کہ گلہ بان گلّے سے کہیں بڑھ کر اُس کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے۔ گلّہ کا کوئی جانور جب اس سے الگ ہو کر کسی غلط سمت میں چل نکلتا ہے تو گلہ بان مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہے اور اُس وقت تک اُسے چین نہیں آتا جب تک وہ اُسے غلط راہ سے ہٹا کر صحیح جگہ پر نہیں لے آتا۔

ایک گلہ بان دورِ جدید کے حکمرانوں کی طرح اپنی رعایا کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے

تباہی اور بربادی کے راستوں پر نہیں دھکیلتا بلکہ وہ جس لمحہ بھی کسی جانور میں کوئی غلط رُجحان محسوس کرتا ہے تو فوراً اُس کی اصلاح کی تدبیر کرتا ہے۔ اسی طرح جب اُس کے گلّے کو باہر سے کوئی خطرہ محسوس ہو تو وہ اس کا پوری قوت اور جرأت سے مقابلہ کرتا ہے اور اس معاملہ میں جان کی بازی لگانے میں بھی اُسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ جن بھیڑ بکریوں کا اُسے نگران مقرر کیا گیا ہے وہ اُن کی جانوں کو اپنی جان سے عزیز تر سمجھتا ہے۔

حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں رعایا کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کے حُسنِ سلوک کی کیا اہمیت ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل احادیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کسی شخص کو ذمہ داری کا منصب سونپ کر رخصت کرتے تو اُسے یہ نصیحت ضرور فرماتے:

بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا۔ (متفق علیہ)	لوگوں کو خوشخبری دو اور انہیں خوف زدہ نہ کرو۔ انہیں سہولت دو اور انہیں تنگی میں مبتلا نہ کرو

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب امر کے بارے میں اکثر یہ دُعا فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِي شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ، فَاشْقُقْ عَلَيْهِ۔ وَمَنْ وَلِيَ مِنْ امْرِ اُمَّتِي شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِمْ، فَارْفُقْ بِهٖ (مسلم)	اے اللہ جو کوئی کسی معاملہ میں میری اُمت کا نگران بنا اور اس نے لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا تو بھی اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر اور جو کوئی کسی معاملہ میں میری اُمت کا والی بنا اور اس نے لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا تو بھی اُس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر۔

معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے حکمرانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

کوئی شخص جسے مسلمان رعایا کا نگران مقرر کیا گیا ہو، وہ اگر عوام کے حقوق کے معاملے میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل نہ ہونے دے گا۔ (متفق علیہ)

عوام کے حقوق میں خیانت کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ بحیثیت حکمران (باقی بر صفحہ ۴۵)

باب (۱۱)

اِسراء و معراج
(۴)

معراج کا ایک اور رُخ اس سلسلۂ بیان میں معراج کا ایک اور رُخ بھی قارئین کے سامنے پیش کر دینا مناسب ہوگا جس سے اُن بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا جو معراج کی کیفیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

جبریلؑ سے حضورؐ کی پہلی ملاقات زمین پر قرآن مجید، سورۂ نجم میں پہلے جبریل علیہ السّلام سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اُس ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ وہ اپنی اصلی صورت میں پہلی مرتبہ اُفُق پر نظر آئے اور پھر قریب قریب ہوتے ہوتے اس قدر قریب ہوگئے کہ آپ کے اور ان کے درمیان دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا اور اُس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پہنچائی۔ یہ ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى	نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہ
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى	ملایا۔ اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو
(النجم-۱۱-۱۲)	جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟

یعنی یہ مُشاہدہ جو دن کی روشنی میں اور پوری بیداری کی حالت میں کھلی آنکھوں سے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہوا، اس پر اُن کے دل نے یہ نہیں کہا کہ یہ نظر کا دھوکا ہے، یا یہ کوئی جن یا شیطان ہے جو مجھے نظر آرہا ہے، یا میرے سامنے کوئی خیالی صورت آگئی ہے اور میں جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، بلکہ ان کے دل نے ٹھیک ٹھیک وہی کچھ سمجھا جو اُن کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اُنھیں اس امر میں کوئی شک لاحق نہیں ہوا کہ فی الواقع یہ جبریلؑ ہیں اور جو پیغام یہ پہنچا رہے ہیں وہ واقعی خدا کی طرف سے وحی ہے۔

ایسے غیر معمولی مشاہدات پر حضورؐ کے کسی شک میں مبتلا نہ ہونے کے وجوہ

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ بات کیا ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے عجیب اور غیر معمولی مشاہدے کے بارے میں قطعاً کوئی شک لاحق نہ ہوا اور آپ نے پورے یقین کے ساتھ جان لیا کہ آپ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ واقعی حقیقت ہے، کوئی خیالی ہیولیٰ نہیں ہے، اور کوئی جن یا شیطان بھی نہیں ہے؟ اس سوال پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس کے پانچ وجوہ ہماری سمجھ میں آتے ہیں:

ایک یہ کہ وہ خارجی حالات جن میں مشاہدہ ہوا تھا، اُس کی صحت کا یقین دلانے والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشاہدہ اندھیرے میں، یا مراقبے کی حالت میں، یا خواب میں، یا نیم بیداری کی حالت میں نہیں ہوا تھا، بلکہ صبح روشن طلوع ہو چکی تھی، آپؐ پوری طرح بیدار تھے، کھلی فضا میں اور دن کی پوری روشنی میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر ٹھیک اسی طرح دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی شخص دنیا کے دوسرے مناظر دیکھتا ہے۔ اس میں اگر شک کی گنجائش ہو تو ہم دن کے وقت دریا، پہاڑ، آدمی، مکان، غرض جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ سب بھی پھر مشکوک اور محض نظر کا دھوکا ہی ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آپ کی اپنی داخلی حالت بھی اُس کی صحت کا یقین دلانے والی تھی۔ آپ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھے۔ پہلے سے آپ کے ذہن میں اس طرح کا سرے سے کوئی خیال نہ تھا کہ آپ کو ایسا کوئی مشاہدہ ہونا چاہیے، یا ہونے والا ہے۔ ذہن اس فکر اور اس کی تلاش سے بالکل خالی تھا۔ اور اس حالت میں اچانک آپؐ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آیا۔ اس پر یہ شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ آنکھیں کسی حقیقی منظر کو نہیں دیکھ رہی ہیں بلکہ ایک خیالی ہیولیٰ سامنے آگیا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو ہستی ان حالات میں آپؐ کے سامنے آئی تھی وہ ایسی عظیم، ایسی شاندار، ایسی حسین اور اس قدر منوّر تھی کہ نہ آپؐ کے وہم و خیال میں کبھی اس سے پہلے ایسی ہستی کا تصور آیا تھا جس کی وجہ سے آپؐ کو گمان ہوتا کہ وہ آپؐ کے اپنے خیال کی آفریدہ ہے، اور نہ کوئی جن یا شیطان اس شان کا ہو سکتا ہے کہ آپؐ اُسے فرشتے کے سوا کچھ اور سمجھتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "میں نے جبریلؑ کو اس صورت میں دیکھا کہ اُن کے چھ سو بازو تھے" (مسند احمد)۔ ایک دوسری روایت میں ابن مسعودؓ مزید تشریح کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام کا ایک ایک بازو اتنا عظیم تھا کہ اُفق پر چھایا ہوا نظر آتا تھا (مسند احمد)۔ اللہ تعالیٰ خود اُن کی شان کو شَدِیْدُ الْقُوٰی (زبردست قوت والا) اور

ذُوۡ مِرَّةٍ (نہایت حسین اور شاندار) کے الفاظ میں بیان فرما رہا ہے۔

چوتھے یہ کہ جو تعلیم وہ ہستی دے رہی تھی وہ بھی اِس مشاہدے کی صحت کا اطمینان دلانے والی تھی۔ اُس کے ذریعے سے اچانک جو علم، اور تمام کائنات کے حقائق پر حاوی علم آپؐ کو ملا اُس کا تصور پہلے سے آپؐ کے ذہن میں نہ تھا کہ آپؐ اُس پر یہ شبہ کرتے کہ یہ میرے ہی خیالات ہیں جو مرتّب ہو کر میرے سامنے آگئے ہیں۔ اِسی طرح اُس علم پر یہ شک کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی کہ شیطان اِس شکل میں آکر آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ کیونکہ شیطان کا یہ کام آخر کب ہو سکتا ہے اور کب اُس نے یہ کام کیا ہے کہ انسان کو شرک و بت پرستی کے خلاف توحیدِ خالص کی تعلیم دے؟ آخرت کی باز پُرس سے خبردار کرے؟ جاہلیت اور اس کے طور طریقوں سے بیزار کرے؟ فضائلِ اخلاق کی طرف دعوت دے؟ اور ایک شخص سے یہ کہے کہ نہ صرف تو خود اس تعلیم کو قبول کر بلکہ ساری دنیا سے شرک اور ظلم اور فسق و فجور کو مٹانے اور اِن بُرائیوں کی جگہ توحید اور عدل اور تقوٰی کی بھلائیاں قائم کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو؟

پانچویں اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو اپنی نبوت کے لیے چُن لیتا ہے تو اُس کے دل کو شکوک و شبہات اور وَساوِس سے پاک کر کے یقین و اِذعان سے بھر دیتا ہے۔ اِس حالت میں اُس کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں، اور اس کے کان جو کچھ سُنتے ہیں، اُس کی صحت کے متعلق کوئی ادنیٰ سا تردُّد بھی اُس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پورے شرحِ صدر کے ساتھ ہر اُس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے جو اُس کے رب کی طرف سے اس پر منکشف کی جاتی ہے، خواہ وہ کسی مشاہدے کی شکل میں ہو جو اُسے آنکھوں سے دکھایا جائے، یا الہامی علم کی شکل میں ہو جو اُس کے دل میں ڈالا جائے، یا پیغامِ وحی کی شکل میں ہو جو اس کو لفظ بلفظ سنایا جائے۔ اِن تمام صورتوں میں پیغمبر کو اِس امر کا پورا شعور ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے قطعی محفوظ و مامون ہے اور جو کچھ بھی اُس تک کسی شکل میں پہنچ رہا ہے وہ ٹھیک ٹھیک اُس کے رب کی طرف سے ہے۔ تمام خداداد احساسات کی طرح پیغمبر کا یہ شعور و احساس بھی ایک ایسی یقینی چیز ہے جس میں غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں۔ جس طرح مچھلی کو اپنے تیراک ہونے کا، پرندے کو اپنے پرندہ ہونے کا، اور انسان کو اپنے انسان ہونے کا احساس بالکل خداداد ہوتا ہے اور اس میں غلط فہمی کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح پیغمبر کو اپنے پیغمبر ہونے کا احساس بھی خداداد ہوتا ہے، اُس کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ وسوسہ نہیں آتا کہ شاید اُسے پیغمبر ہونے کی غلط فہمی لاحق

ہو گئی ہے۔

جبریلؑ سے دوسری ملاقات سدرۃ المنتہٰی پر اس کے بعد اسی سورت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۙ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۙ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۙ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى - (النجم - آیات ۱۳ تا ۱۸)	اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی کے پاس اُس کو دیکھا جہاں پاس ہی جنّت الماوٰی ہے - اُس وقت سِدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا - نگاہ نہ چُندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی - اور اُس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

یہ جبریل علیہ السلام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ملاقات کا ذکر ہے جس میں وہ آپ کے سامنے اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے - اس ملاقات کا مقام "سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی" بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کے قریب "جَنَّۃُ الْمَاْوٰی" واقع ہے۔

سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی سِدرہ عربی زبان میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں، اور مُنْتَہٰی کے معنی ہیں آخری سرا - "سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی" کے لغوی معنی ہیں "وہ بیری کا درخت جو آخری یا انتہائی سرے پر واقع ہے"۔ علامہ آلوسیؒ نے رُوح المعانی میں اس کی تشریح یہ کی ہے کہ الیہا ینتھی علم کل عالم وما وراءھا لا یعلمہ الا اللہ۔ "اس پر ہر عالِم کا علم ختم ہو جاتا ہے، آگے جو کچھ ہے اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔ قریب قریب یہی تشریح ابن جریر نے اپنی تفسیر میں، اور ابن اثیر نے النہایہ فی غریب الحدیث و الاثر میں کی ہے - ہمارے لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ اس عالمِ مادّی کی آخری سرحد پر وہ بیری کا درخت کیسا ہے اور اس کی حقیقی نوعیت و کیفیت کیا ہے - یہ کائناتِ خداوندی کے وہ اسرار ہیں جن تک ہمارے فہم کی رسائی نہیں ہے - بہرحال وہ کوئی ایسی ہی چیز ہے جس کے لیے انسانی زبان کے الفاظ میں "سدرہ" سے زیادہ موزوں لفظ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔

جنّتُ الماوٰی جنّت الماوٰی کے لغوی معنی ہیں "وہ جنت جو قیام گاہ بنے"۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ یہ وہی جنت ہے جو آخرت میں اہل ایمان و تقویٰ کو ملنے والی ہے، اور اسی آیت سے انہوں نے استدلال کیا ہے کہ وہ جنت آسمان میں ہے - قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ جنّت ہے جس میں شہداء کی ارواح رکھی جاتی

ہیں۔ اس سے مراد وہ جنت نہیں ہے جو آخرت میں ملنے والی ہے۔ ابن عباسؓ بھی یہی کہتے ہیں اور اس پر وہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ آخرت میں جو جنت اہلِ ایمان کو دی جائے گی وہ آسمان میں نہیں ہے بلکہ اُس کی جگہ یہی زمین ہے۔

سدرہ پر تجلیاتِ خداوندی اور یہ ارشاد کہ "اُس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی شان اور اس کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ وہ ایسی تجلیات تھیں کہ نہ انسان ان کا تصور کر سکتا ہے اور نہ کوئی انسانی زبان اس کے وصف کی متحمل ہے۔

حضورؐ کا کمالِ ضبط و تحمل پھر حضورؐ کی تعریف میں فرمایا گیا کہ نہ آپ کی نگاہ اُن تجلیات کو دیکھ کر چکاچوند صیائی، نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ یعنی ایک طرف تو آپ کے کمالِ تحمل کا حال یہ تھا کہ ایسی زبردست تجلیات کے سامنے بھی آپ کی نگاہ میں کوئی چکاچوند پیدا نہ ہوئی اور آپ پورے سکون کے ساتھ ان کو دیکھتے رہے دوسری طرف آپ کے ضبط اور یکسوئی کا کمال یہ تھا کہ جس مقصد کے لیے آپ کو بلایا گیا تھا اُسی پر آپ اپنے ذہن اور اپنی نگاہ کو مرکوز کیے رہے اور جو حیرت انگیز مناظر وہاں تھے ان کو دیکھنے کے لیے آپ نے ایک تماشائی کی طرح ہر طرف نگاہیں دوڑانی نہ شروع کر دیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو ایک عظیم و جلیل بادشاہ کے دربار میں حاضری کا موقع ملتا ہے اور وہاں وہ کچھ شان و شوکت اس کے سامنے آتی ہے کہ جو اُس کی چشمِ تصور نے بھی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب اگر وہ شخص کم ظرف ہو تو وہاں پہنچ کر بھونچکا رہ جائے گا، اور اگر آدابِ حضوری سے ناآشنا ہو تو مقامِ شاہی سے غافل ہو کر دربار کی سجاوٹ کا نظارہ کرنے کے لیے ہر طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگے گا۔ لیکن ایک عالی ظرف، ادب آشنا اور فرض شناس آدمی نہ تو وہاں پہنچ کر مبہوت ہو گا اور نہ دربار کا تماشا دیکھنے میں مشغول ہو جائے گا، بلکہ وہ پورے وقار کے ساتھ حاضر ہو گا اور اپنی ساری توجہ اُس مقصد پر مرتکز رکھے گا جس کے لیے دربارِ شاہی میں اس کو طلب کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی خوبی ہے جس کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے۔

کیا حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا؟ آخری آیت میں فرمایا کہ آپؐ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں

یہ آیت اس امر کی تصریح کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ اُس کی عظیم الشان آیات (نشانیوں) کو دیکھا تھا، اور چونکہ سیاق و سباق کی رو سے یہ دوسری ملاقات بھی اُسی ہستی سے ہوئی تھی جس سے پہلی ملاقات ہوئی، اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اُفقِ اعلیٰ پر جس کو آپؐ

نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، اور جو قریب آتے آتے بس دو کمان یا اس سے بھی کم فاصلے پر آگیا تھا، وہ بھی اللہ نہ تھا، اور دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کو دیکھا وہ بھی اللہ نہ تھا۔ اگر آپؐ نے اِن مواقع میں سے کسی موقع پر بھی اللہ جلّ شانہٗ کو دیکھا ہوتا تو یہ اِتنی بڑی بات تھی کہ یہاں ضرور اُس کی تصریح کر دی جاتی۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کی تھی اور انہیں جواب دیا گیا تھا کہ لَنْ تَرٰانِیْ۔ "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے" (الاعراف ۱۴۳) ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ شرف، جو حضرت موسیٰؑ کو عطا نہیں کیا گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیا جاتا، تو اس کی اہمیت خود ایسی تھی کہ اُسے صاف الفاظ میں بیان کر دیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ حضورؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا، بلکہ واقعۂ معراج کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ بنی اسرائیل میں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم اپنے بندے کو اس لیے لے گئے تھے کہ "اس کو اپنی نشانیاں دکھائیں" (لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا)، اور یہاں سدرۃ المنتہیٰ پر حاضری کے سلسلے میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ "اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں (لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى)۔

اِن وجوہ سے بظاہر اِس بحث کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن دونوں مواقع پر اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا یا جبریل علیہ السلام کو؟ لیکن جس وجہ سے یہ بحث پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ اس مسئلے پر احادیث کی روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم ترتیب وار اُن احادیث کو درج کرتے ہیں جو اِس سلسلے میں مختلف صحابہ سے منقول ہوئی ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایات بخاری، کتاب التفسیر میں حضرت مسروق کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا "اماں جان، کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟" انہوں نے جواب دیا "تمہاری اِس بات سے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تم یہ کیسے بھول گئے کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کا اگر کوئی شخص دعویٰ کرے تو جھوٹا دعویٰ کرے گا؟" (اُن میں سے پہلی بات حضرت عائشہؓ نے یہ فرمائی کہ) "جو شخص تم سے یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ جھوٹ کہتا ہے۔" پھر حضرت عائشہؓ نے یہ آیتیں پڑھیں، لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (نگاہیں اُس کو نہیں پا سکتیں)، اور وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر یا تو وحی کے طور پر، یا پردے کے پیچھے سے،

یا یہ کہ ایک فرشتہ بھیجے اور وہ اس پر اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ وہ چاہے)۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا "لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو دو مرتبہ اُن کی اصلی صورت میں دیکھا تھا"۔

اِس حدیث کا ایک حصّہ بخاری، کتاب التوحید، باب ۴ میں بھی ہے۔ اور کتاب بدءُ الخلق میں مسروق کی جو روایت امام بخاری نے نقل کی ہے اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ کی یہ بات سن کر عرض کیا کہ پھر اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی؟ اس پر انہوں نے فرمایا "اس سے مراد جبریلؑ ہیں۔ وہ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انسانی شکل میں آیا کرتے تھے، مگر اِس موقع پر وہ اپنی اصلی شکل میں آپ کے پاس آئے اور سارا اُفق اُن سے بھر گیا"۔

مسلم کتاب الایمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتہیٰ میں حضرت عائشہؓ سے مسروق کی یہ گفتگو زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل ہوئی ہے اور اِس کا سب سے اہم حصّہ یہ ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا "جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افترا کرتا ہے"۔ مسروق کہتے ہیں کہ میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یہ بات سُن کر میں اُٹھ بیٹھا اور میں نے عرض کیا "ام المومنین، جلدی نہ فرمائیے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ؟ اور وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى"؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا اِس اُمت میں سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس معاملے کو دریافت کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا اِنَّمَا ھُوَ جبریل علیہ السلام، لَمْ اَرَہٗ علٰی صورتِہٖ الّتی خلق علیھا غیرھاتین المرتین، رایتہ منھبطا من السماء سادًّا عظم خلقہ ما بین السماء والارض۔ "وہ تو جبریل علیہ السلام تھے۔ میں نے اُن کو اُن کی اُس اصلی صورت میں جس پر اللہ نے اُن کو پیدا کیا ہے، اِن دو مواقع کے سوا کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو آسمان سے اُترتے ہوئے دیکھا اِس حال میں کہ اُن کی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی"۔

ابن مَرْدُوْیَہ نے مسروق کی اِس روایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے وہ یہ ہیں۔ حضرت عائشہ نے فرمایا "سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ حضورؐ نے جواب دیا نہیں، میں نے تو جبریلؑ کو آسمان سے اُترتے دیکھا تھا"۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایات | بخاری، کتاب التفسیر، مسلم، کتاب الایمان اور ترمذی، ابواب التفسیر

میں زِرّ بن حُبَیش کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کی تفسیر یہ بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو اس صورت میں دیکھا کہ اُن کے چھ سو بازو تھے۔ مسلم کی دوسری روایت میں مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ، اور لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى کی بھی یہی تفسیر زِرّ بن حبیش نے عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کی ہے۔

مُسند احمد میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ تفسیر زِرّ بن حُبَیش کے علاوہ عبدالرحمٰن بن یزید اور ابووائل کے واسطے سے بھی منقول ہوئی ہے۔ اور مزید برآں مُسند احمد میں زِرّ بن حُبَیش کی دو روایتیں اور نقل ہوئی ہیں جن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتُ جِبْرِيْلَ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عَلَيْهِ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جبریلؑ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا، اُن کے چھ سو بازو تھے"۔ اسی مضمون کی روایت امام احمد نے شَقیق بن سَلَمہ سے نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی زبان سے یہ سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا تھا کہ میں نے جبریل علیہ السلام کو اس صورت میں سِدرۃ المُنتہیٰ پر دیکھا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے عطاء بن ابی رباح نے آیت لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى کا مطلب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ رَاٰى جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۔ "حضورؐ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا تھا" (مسلم کتاب الایمان)۔

حضرت ابوذرؓ کی روایات حضرت ابوذر غفاریؓ سے عبداللہ بن شَقیق کی دو روایتیں امام مسلم نے کتاب الایمان میں نقل کی ہیں۔ ایک روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟" حضورؐ نے جواب دیا "نُوْرٌ اَنّٰى اَرَاهُ" ۔ اور دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب آپ نے یہ دیا کہ "رَاَيْتُ نُوْرًا" ۔ حضورؐ کے پہلے ارشاد کا مطلب ابن القیم نے زادالمعاد میں یہ بیان کیا ہے کہ "میرے اور رویتِ رب کے درمیان نور حائل تھا" اور دوسرے ارشاد کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے اپنے رب کو نہیں بلکہ بس ایک نور دیکھا"۔

نسائی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوذرؓ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے رب کو دل سے دیکھا تھا، آنکھوں سے نہیں دیکھا"۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری روایت | حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے امام مسلم کتاب الایمان میں یہ روایت لائے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ما انتہی الیہ بصرہ من خلقہ۔ " اللہ تعالیٰ تک اس کی مخلوق میں سے کسی کی نگاہ نہیں پہنچی"۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایات | مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اور وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ اپنے دل سے دیکھا۔ یہ روایت مُسند احمد میں بھی ہے۔

ابن مَرْدُوْیہ نے عطاء بن ابی رَباح کے حوالہ سے ابن عبّاس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے دیکھا تھا۔

نسائی میں عِکرِمہ کی روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا "اتعجبون ان تکون الخُلّۃ لابراھیم والکلام لموسی والرؤیۃ لمحمد ؟ "کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے خلیل بنایا، موسیٰ علیہ السلام کو کلام سے سرفراز کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رویت کا شرف بخشا"؟ حاکم نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ترمذی میں شَعبی کی روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے ایک مجلس میں فرمایا " اللہ نے اپنی رویت اور اپنے کلام کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے اس نے دو مرتبہ کلام کیا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ اس کو دیکھا"۔ ابن عباسؓ کی اسی گفتگو کو سن کر مَسرُوق حضرت عائشہ رضؓ کے پاس گئے تھے اور ان سے پوچھا تھا "کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا"؟ انہوں نے فرمایا " تم نے وہ بات کہی ہے جسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے"۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور مسروق کے درمیان وہ گفتگو ہوئی جسے ہم اوپر حضرت عائشہؓ کی روایات میں نقل کر آئے ہیں۔

ترمذی ہی میں دوسری روایات جو ابن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں ان میں سے ایک میں وہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ دوسری میں فرماتے ہیں دو مرتبہ دیکھا تھا۔ اور تیسری میں ان کا ارشاد یہ ہے کہ آپ نے اللہ کو دل سے دیکھا تھا۔

مسند احمد میں ابن عباسؓ کی ایک روایت یہ ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأیت ربی تبارک و تعالیٰ۔ "میں نے اپنے رب تبارک و تعالیٰ کو دیکھا۔" دوسری روایت میں وہ کہتے ہیں ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتانی ربی اللیلۃ فی احسن صورۃ، احسبہ یعنی فی النوم۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج میرا رب بہترین صورت میں میرے پاس آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضورؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ خواب میں آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔"

طبرانی اور ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا، ایک مرتبہ آنکھوں سے اور دوسری مرتبہ دل سے۔

محمد بن کعب القرظی کی روایت محمد بن کعب القرظی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے پوچھا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا "میں نے اس کو دو مرتبہ اپنے دل سے دیکھا"۔ (ابن ابی حاتم)۔ اس روایت کو ابن جریر نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا "میں نے اُس کو آنکھ سے نہیں بلکہ دل سے دو مرتبہ دیکھا ہے"۔

حضرت انسؓ کی روایت حضرت انس بن مالک کی ایک روایت جو قصۂ معراج کے سلسلے میں شریک بن عبداللہ کے حوالے سے امام بخاری نے کتاب التوحید میں نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ آتے ہیں حتی جاء سدرۃ المنتھی ودنی الجبار رب العزۃ فتدلّٰی حتی کان منہ قاب قوسین او ادنیٰ فاوحی اللہ فیما اوحی الیہ خمسین صلوٰۃً۔ یعنی "جب آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو اللہ رب العزّت آپ کے قریب آیا اور آپ کے اُوپر معلّق ہوگیا یہاں تک کہ آپ کے اور اس کے درمیان بقدر دو کمان یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا، پھر اللہ نے آپؐ پر جو اُمور وحی فرمائے ان میں سے ایک پچاس نمازوں کا حکم تھا"۔ لیکن علاوہ اُن اعتراضات کے جو اس روایت کی سند اور مضمون پر امام خطّابی، حافظ ابن حجرؒ، ابن حزم اور حافظ عبدالحق صاحبُ الجمعِ بینَ الصحیحین نے کیے ہیں، سب سے بڑا اعتراض اس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ صریح قرآن کے خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید دو الگ الگ رویتوں کا ذکر کرتا ہے جن میں سے ایک ابتداءً اُفقِ اعلیٰ پر ہوئی تھی اور پھر اس میں دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوسَینِ اَو اَدنیٰ کا معاملہ پیش آیا تھا، اور دوسری سِدرۃ المنتہیٰ کے پاس واقع ہوئی تھی۔ لیکن یہ روایت ان دونوں رویتوں کو خلط ملط کرکے ایک رویت بنا دیتی ہے، اس لیے قرآن مجید سے مُتعارض

ہونے کی بنا پر اس کو توکسی طرح قبول ہی نہیں کیا جاسکتا۔

اب رہیں وہ دوسری روایات جو ہم نے اُوپر نقل کی ہیں، تو ان میں سب سے زیادہ وزنی روایتیں وہ ہیں جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عائشہؓ سے منقول ہوئی ہیں۔ کیونکہ ان دونوں نے بالاتفاق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا ہے کہ ان دونوں مواقع پر آپ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ جبریل علیہ السلام کو دیکھا تھا، اور یہ روایات قرآن مجید کی تصریحات اور اشارات سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں۔ مزید برآں اُن کی تائید حضورؐ کے اُن ارشادات سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے آپ سے نقل کیے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت عبداللہؓ بن عباس سے جو روایات کتبِ حدیث میں منقول ہوئی ہیں ان میں سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ کسی میں وہ دونوں رویتوں کو عینی کہتے ہیں، کسی میں دونوں کو قلبی قرار دیتے ہیں، کسی میں ایک کو عینی اور دوسری کو قلبی بتاتے ہیں، اور کسی میں عینی رویت کی صاف صاف نفی کر دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی روایت بھی ایسی نہیں ہے جس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی ارشاد نقل کر رہے ہوں۔ اور جہاں اُنہوں نے خود حضورؐ کا ارشاد نقل کیا ہے، وہاں اوّل تو قرآن مجید کی بیان کردہ اِن دونوں رویتوں میں سے کسی کا بھی ذکر نہیں ہے، اور مزید برآں ان کی ایک روایت کی تشریح دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے کسی وقت بحالتِ بیداری نہیں بلکہ خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ اس لیے درحقیقت ان آیات کی تفسیر میں حضرت عبداللہؓ بن عباس سے منسوب روایات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح محمد بن کعب القُرَظی کی روایات بھی اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد نقل کرتی ہیں، لیکن ان میں اُن صحابہؓ کرام کے ناموں کی کوئی تصریح نہیں ہے جنہوں نے حضورؐ سے یہ بات سُنی۔ نیز ان میں سے ایک میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضورؐ نے عینی رویت کی صاف صاف نفی فرما دی تھی۔

(باقی)

تصحیح مزید

ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعت میں تفہیم القرآن، جلد ششم کی جس عبارت کی اصلاح کرنے کے لیے لکھا گیا تھا، غلطی سے اس میں صفحہ کا نمبر چھوٹ گیا۔ وہ عبارت جلد ششم کے صفحہ ۲۵۴، حاشیہ ایک سطر ۹ میں ہے۔

تقریر عید الاضحیٰ

[یہ اُس تقریر کا مکمل متن ہے جو ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ کو منصورہ میں کی گئی تھی]

برادرانِ ملت !

ہمارے اُوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات بے حد وحساب ہیں جن کا کوئی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بلاشبہ اُس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے ہم کو خالص توحید اور بے آمیز توحید کی تعلیم دی، جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں کسی دوسرے کی ادنیٰ سے ادنیٰ شرکت کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں ہے اور تمام حیثیتوں سے خدائی صرف ایک معبودِ برحق کے لیے مخصوص ہے۔ یہ کتنی بڑی نعمت ہے، اِس کی صحیح قدر آپ صرف اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب توحید اور شرک کے فرق کو بخوبی سمجھ لیں۔

شرک کا لازمی خاصہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کو بانٹتا اور انسانوں کو انسانوں سے پھاڑتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جو یہ شہادت دیتی ہو کہ تمام دُنیا کے مشرکین کسی ایک معبود پر، یا چند معبودوں پر کبھی جمع ہوئے ہوں۔ ساری دنیا تو درکنار، زمین کے کسی ایک خطے میں بسنے والے مشرک بھی کسی معبود، یا معبودوں کے کسی گروہ پر متفق نہیں پائے گئے۔ قبیلوں اور قبیلوں کے معبود الگ رہے ہیں۔ اور یہ جدا جدا معبود بھی ہمیشہ معبود نہیں رہے بلکہ زمانے کی ہر گردش کے ساتھ بدلتے چلے گئے ہیں۔ اِس طرح شرک کبھی کسی دَور میں بھی انسانیت کو جمع کرنے والی طاقت نہیں رہا بلکہ ایک تفرُقہ پرداز طاقت رہا ہے۔ اور وہ صرف عقیدے ہی کے اعتبار سے انسانوں کو ایک دوسرے سے نہیں پھاڑتا۔ اُس کی فطرت چونکہ متحد کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے اس لیے جو تفرُقے اُس کی بدولت برپا ہوتے ہیں وہ رفتہ رفتہ انسانوں میں قوموں اور قبیلوں اور نسلوں اور زبانوں اور رنگوں اور وطنوں کے اختلافات اُبھار دیتے ہیں۔ پھر یہی اختلافات آگے بڑھ کر لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ذلیل و حقیر اور ناپاک اور اچھوت سمجھنے کے محرک بنتے ہیں۔ ایک دوسرے

کا حق مارنے اور ایک دوسرے پر ظلم ڈھانے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار انہی کی بدولت دنیا میں خونریزیاں ہوتی ہیں، قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا ہے، لڑائیاں ہوتی ہیں، اور شر و فساد سے خدا کی زمین بھر جاتی ہے۔ آج تک جتنی لڑائیاں بھی انسانوں اور انسانوں کے درمیان ہوئی ہیں، آپ ان کے اسباب کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان سب کے پیچھے شرک اپنی کسی نہ کسی صورت میں کارفرما رہا ہے، یا اُس کی پیدا کردہ خباثتوں میں سے کوئی خباثت اُن کی محرک ہوئی ہے۔

اس کے برعکس توحید، اگر شرک کی ہر آمیزش سے پاک ہو، تو اُس کا لازمی خاصّہ انسانیت کو بانٹنے اور انسانوں کو انسانوں سے پھاڑنے کے بجائے، ان کو باہم جوڑنا اور ایک ربّ العالمین کی بندگی و اطاعت پر جمع اور متحد کرنا ہے۔ جتنے لوگ بھی مخلوقات کی خدائی کے ہر تصور سے اپنے ذہن کو پاک کر کے صرف ایک خدا کو معبودِ برحق مان لیں گے، اور خداوندِ عالم کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں سے کسی چیز میں بھی کسی مخلوق کی شرکت کے باطل خیال کو اپنے دل و دماغ کے ہر گوشے سے نکال باہر کریں گے وہ لازماً ایک اُمت بنیں گے۔ یقیناً ان میں وحدت پیدا ہوگی۔ ضرور وہ ایک دوسرے کے رفیق اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں گے۔ تاریخ میں اِس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک اللہ کی وحدانیت کے سوا کوئی دوسری چیز انسانوں کو جمع کرنے والی پائی گئی ہو۔ اگر انسان جمع ہو سکتے ہیں تو صرف اُس ایک معبود پر جو حقیقتاً ساری کائنات کا معبود ہے۔ اُسی کے ماننے پر اُن کے اندر اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور اُسی کی بندگی پر اتفاق اُنہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا سکتا ہے۔ توحیدِ اِلٰہ کا نتیجہ توحیدِ اُمت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی ہے نہ غلط ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر کبھی کسی جگہ آپ دیکھیں کہ توحید پر ایمان کا دعویٰ تو موجود ہے لیکن اس کا دعویٰ کرنے والی اُمت میں وحدت موجود نہیں ہے، بلکہ اُلٹے تفرقے اور تعصبات اور باہمی نفرت و مخالفت کے فتنے برپا ہیں، تو چشمِ بصیرت سے اُن کا جائزہ لے کر آپ بآسانی معلوم کر لیں گے کہ اِس اُمت میں شرک گھس آیا ہے اور اسی کے بے شمار شاخسانوں میں سے کوئی نہ کوئی شاخسانہ اِس کے افراد اور گروہوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ رہا ہے۔ یہ بات نہ ہو تو جس طرح دو اور دو پانچ نہیں ہو سکتے اسی طرح شرک کی آمیزش کے بغیر ایک خدا کے ماننے والے دس متحارب گروہوں میں بٹ نہیں سکتے۔

اب دیکھیے کہ تمام انسانوں کو ہر زمانے اور ہر دَور میں ایک اُمت کے اندر جمع کرنے کے لیے توحید

کی بنیاد فراہم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس وحدت کو دائم و قائم رکھنے کے لیے مزید کیا اہتمام فرمایا ہے۔ اُس نے ایک رسول بھیج کر اور ایک کتاب نازل کر کے انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کے لیے ایک ایسی رہنمائی عطا فرما دی جس سے باہر جا کر انسان کو کہیں اور ہدایت تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ایک اُمت میں جمع ہو جانے کے بعد انسان اگر متفرق ہو سکتے ہیں تو صرف اِس وجہ سے کہ ان کو کسی ایک ماخذ سے پورا نظامِ زندگی نہ ملے اور وہ مختلف حالات، مختلف مقامات اور مختلف زمانوں میں دوسرے ذرائع سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہوں۔ ایسی صورت میں تو بلاشبہ انسان ہدایت کے لیے بہت سے ذرائع کی طرف رجوع کریں گے اور اس سے لازماً ان کے اندر تفرقہ برپا ہوگا۔ لیکن جب ہر زمان و مکان کے لیے ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ذریعے سے ہدایت مل جائے تو وحدتِ معبود پر جمع ہونے والی اُمت کے لیے تفرقے کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا، اِلّا یہ کہ لوگ یا تو جہالت کی بنا پر اُس کی ہدایت سے واقف ہی نہ ہوں، یا پھر ذہن و فکر کی کجی کے باعث اصل ہدایت میں اپنی طرف سے کچھ گھٹائیں اور کچھ بڑھائیں اور اس طرح کی کمی و بیشی کرنے والا ہر گروہ یہ دعوے کرے کہ اُس کا تیار کردہ دین ہی اصل دین ہے جس کی پیروی نہ کرنے والا گمراہ یا فاسق یا کافر ہے۔

دوسری اہم چیز جو وحدتِ اُمت کے استحکام اور راہِ راست پر اس کے ثابت قدم رہنے کے لیے فراہم کی گئی ہے وہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان صرف ایک خدا کے سامنے جواب دِہ ہے۔ وہی ایک خدا دُنیا میں بھی اُس کی قسمت بنانے اور بگاڑنے کے مکمل اختیارات رکھتا ہے، اور وہی ایک خدا روزِ جزا کا بھی مالک ہے۔ اُس کے سوا کوئی انسانوں کے اعمال کی باز پرس کرنے والا ہے، نہ کسی کے ہاتھ میں سزا یا جزا دینے کے اختیارات ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ عقیدہ نہ صرف وحدتِ اُمت کا ضامن ہے بلکہ اسی پر انسانی سیرت و کردار کے راست و درست رہنے کا انحصار ہے۔ اِس عقیدے کے اِن لازمی نتائج کو ضائع کرکے اگر کوئی چیز انسانوں کو پراگندہ اور بے راہ رَو بنانے والی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگ دنیا میں خدا کے سوا دوسری مختلف ہستیوں کو حاجت روا قرار دینے لگیں اور آخرت کے بارے میں یہ سمجھنے لگیں کہ وہاں خدا کے انصاف میں مداخلت کرنے کے اختیارات کچھ دوسری ہستیوں کو حاصل ہوں گے۔

اِس کے بعد دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی چیزیں ہم پر لازم کی ہیں جو وحدتِ اُمت کو عملاً قائم

اور دُنیا سرگرم رکھنے والی ہیں ۔ اِن میں اوّلین چیز نماز ہے جو روزانہ پانچ وقت کے لیے دُنیا بھر کے مسلمانوں پر فرض کر دی گئی ہے ۔ اُس کے لیے ایک قبلہ مقرر ہے جس کی طرف ہر نماز کے وقت مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب اور ان مختلف سمتوں کے درمیان رہنے والے سب مسلمانوں کو رُخ کرنا ہوتا ہے ۔ اِس نقشے کو ذرا چشمِ تصور کے سامنے لا کر تو دیکھیے کہ خانہ کعبہ ایک مرکز ہے جس کے گرد تمام روئے زمین کے مسلمان اُسی ایک مرکز کی طرف رخ کیے ہوئے قیام و قعود اور رکوع و سجود کر رہے ہیں ۔ ہر نماز کے وقت یہ دائرہ حرم پاک سے شروع ہوتا ہے جہاں خانہ کعبہ کے گرد نماز پڑھنے والے تمام لوگ ایک ہالہ بنے ہوئے نظر آتے ہیں، اور پھر یہی دائرہ پھیلتے پھیلتے تمام روئے زمین پر محیط ہو جاتا ہے ۔ یہ روزانہ پانچ وقت کا عمل ہے ۔ اِس سے بڑھ کر وحدت کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟ اور اسلام کے سوا یہ مظاہرہ آپ اور کہاں پاتے ہیں ؟

اِس پنجوقتہ نماز کو فرض کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے جماعت کے ساتھ ادا کرنا لازم کیا ہے، اِلّا یہ کہ کوئی مسلمان اپنی جگہ تنہا ہو اور اُسے جماعت نہ مل رہی ہو ۔ اللہ کی عبادت کا مقصد تو فرداً فرداً نماز پڑھنے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا ، مگر وحدتِ اُمت کا مقصد نمازِ باجماعت کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہ تھا ۔ اسی لیے لازم کیا گیا کہ جہاں دو مسلمان بھی موجود ہوں وہاں ایک امام اور دوسرا مقتدی بنے اور دونوں مل کر باجماعت نماز ادا کریں ۔

نماز کے لیے لوگوں کو بُلانے کا طریقہ بھی اسلام میں ایسا بے نظیر مقرر کیا گیا ہے جو دُنیا کے کسی مذہبی یا لامذہب گروہ کو اپنے کسی اجتماع کی دعوتِ عام دینے کے لیے میسر نہیں ہے ۔ نماز کا بلاوا دینے کے لیے روئے زمین پر ہر جگہ ہر روز پانچوں وقت ایک ہی زبان میں اذان کی آواز بلند کی جاتی ہے ، قطع نظر اِس سے کہ بلانے والوں اور بلائے جانے والوں کی اپنی زبان خواہ کچھ بھی ہو ۔ اِس مشترک زبان کی اذان دنیا میں جہاں بھی بلند ہو گی اسے سننے والا ہر مسلمان جان لے گا کہ یہ نماز کا بلاوا ہے اور فلاں مقام سے بلند ہو رہا ہے جہاں مجھے اپنے برادرانِ ملت کے ساتھ جمع ہو کر خدائے واحد کی عبادت بجا لانی ہے ۔ پھر کمال یہ ہے کہ اذان صرف نماز کا بلاوا ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کے پورے عقیدے کا اعلان بھی ہے ۔ اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں ۔ اور میری فلاح اُسی ایک خدا کی عبادت سے وابستہ ہے جس کی طرف آنے کے لیے مجھے پکارا جا رہا ہے ۔ کیا اِک

سے بہتر طریق دعوت کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے ؟ یہ دعوت دُنیا میں ہر جگہ لوگوں کو نماز کے لیے جمع بھی کرتی ہے اور ایک ہی عقیدے پر متفق بھی۔

پھر نماز کے اوقات، اُس کو ادا کرنے کے طریقے، اور اس میں پڑھی جانے والی چیزیں تمام دنیا میں یکساں ہیں۔ بعض جزوی چیزوں میں اگر کچھ فرق ہے بھی تو وہ ایسا نہیں ہے کہ جنوبی افریقہ کا مسلمان شمالی امریکہ میں، یا جاپان کا مسلمان مراکو یا فرانس میں جا کر یہ محسوس کرے کہ یہاں نماز کے بجائے کوئی اور عبادت کی جا رہی ہے۔ اس طرح یہ نماز خدا پرستی کے جذبے کو ہر دم تازہ بھی کرتی ہے اور خدا پرستوں میں عالمگیر برادری کا احساس زندہ و متحرک بھی رکھتی ہے۔

ایسا ہی معاملہ روزوں کا بھی ہے۔ اگر صرف روزے کی عبادت ہی مقصود ہوتی تو ہر مسلمان کو بس یہ حکم دے دینا کافی تھا کہ وہ سال میں تیس روزے جب چاہے رکھ لے۔ لیکن خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ دُنیا بھر کے مسلمانوں کو اُمتِ واحدہ بھی بنانا مقصود تھا، اس لیے رمضان کا ایک ہی مہینہ ہر سال روزے رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تاکہ تمام مسلمان ایک ساتھ یہ عبادت انجام دیں۔ روزے کی ابتدا اور اس کی انتہا کا بھی ایک ہی وقت رکھا گیا، تاکہ سب کا روزہ ایک ساتھ شروع اور ایک ہی ساتھ ختم ہو۔ روزے کے احکام بھی یکساں رکھے گئے، تاکہ تمام مسلمان عمر بھر ہر سال پورے تیس (یا ۲۹) دن کے روزے ایک ہی طریقے سے، ایک ہی طرح کی پابندیوں کے ساتھ رکھتے رہیں۔ اس سے لازماً دنیا بھر کے مسلمانوں میں یہ شعور زندہ اور تازہ رہتا ہے کہ وہ ایک ہی شرع کی پابندی کرنے والی اُمت ہیں۔ اس پر مستزاد تراویح کی نماز ہے جو پنجوقتہ فرض نماز کے علاوہ ساری دنیا میں رمضان کی ہر رات کو باجماعت ادا کی جاتی ہے اور اس میں بالعموم پورا قرآن پڑھا جاتا ہے۔ یہ عبادت بھی ہے، خدا کے کلامِ پاک کی تبلیغ اور تذکیر بھی ہے، اور وحدتِ اُمت کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم کرنے والی چیز بھی۔ قرآن کو ہر سال مہینہ بھر تک روزانہ سُننے والے خواہ اس کی زبان سے واقف ہوں یا نہ ہوں، اُس کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں، بہر صورت اُن سب میں یہ مشترک احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب ایک کتاب کے ماننے والے ہیں اور وہ کتاب اُن کے رب کی کتاب ہے۔

اب ذرا حج کو دیکھیے جس سے بڑھ کر ملتِ اسلام کے ایک عالمگیر ملت ہونے کا مظاہرہ کسی دوسری عبادت میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کے ہر اُس مسلمان پر، جو حج کی استطاعت رکھتا ہو، یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ

عمر میں ایک مرتبہ اِس فریضے کو انجام دے۔ اور یہ فریضہ صرف چند مقرر تاریخوں ہی میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ جو سال بھر میں صرف ایک بار آتی ہیں۔ اِس طرح روئے زمین پر جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہوں وہاں سے ایک ہی زمانے میں تمام ذی استطاعت مسلمانوں کو مکّہ معظمہ میں جمع ہونا پڑتا ہے۔ آپ غور کیجیے، یہ وہ چیز ہے جو ہر سال دُنیا کے ہر گوشے سے عام انسانوں کو کھینچ کر ایک جگہ لاتی ہے۔ صرف سیاسی مدبرین کو نہیں لاتی جیسے یو۔ این۔ او میں جمع ہوتے ہیں۔ صرف قوموں کے لیڈروں کو بھی نہیں لاتی جیسے بین الاقوامی کانفرنسوں میں آیا کرتے ہیں۔ یہ ہر ملک اور ہر قوم کے عوام کو لاکھوں کی تعداد میں کھینچ لاتی ہے، اور اِس غرض کے لیے لاتی ہے کہ وہ سب مل کر ایک خدا کی عبادت کریں۔ ایک ساتھ خانۂ کعبہ کا طواف کریں۔ ایک ساتھ مکّہ سے منیٰ اور منیٰ سے عرفات، اور عرفات سے مُزدَلِفَہ، اور مُزدَلِفہ سے پھر منیٰ کی طرف کوچ کریں۔ ایک ساتھ قربانیاں دیں۔ ایک ساتھ رَمیِ جمار کریں۔ ایک ساتھ عرفات میں وُقوف اور منیٰ میں چند روز قیام کریں۔ ایک ہی زبان میں سب لبیک لبیک کی آوازیں بلند کریں۔ ایک ساتھ اُس قبلے کے گرد نمازیں ادا کریں جس کی طرف رُخ کر کے ہر روز پانچ مرتبہ وہ اپنی اپنی جگہ نماز پڑھتے رہے ہیں۔ اُن میں ہر نسل، ہر قوم، ہر رنگ اور ہر وطن کے لوگ یکجا ہوتے ہیں۔ ہر زبان بولنے والے اکٹھے ہوتے ہیں۔ سب اپنے اپنے گھروں سے طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے آتے ہیں۔ اُن میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ شاہ بھی ہوتے ہیں اور گدا بھی۔ مگر وہاں یہ سارے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ حرم کے حدود میں پہنچنے سے پہلے ہی سب کے لباس اُتروا کر ایک ہی طرح کا فقیرانہ لباسِ احرام پہنوا دیا جاتا ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ تمیز نہیں کرسکتا کہ کون کہاں کا رہنے والا ہے اور کس کا کیا مرتبہ ہے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اُس کے اُونچے مقام سے اُتار کر عام انسانوں کی سطح پر لے آیا جاتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب و تمدن رکھنے والوں کو بھی بالکل نچلی سطح پر رہنے والوں کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کے ہجوم میں طواف و سعی کرتے ہوئے ایک رئیس کو بھی اُسی طرح دھکّے کھانے پڑتے ہیں جس طرح کوئی عام آدمی دھکّے کھاتا ہے۔ خداوند عالم کے دربار میں پہنچ کر ہر شخص کے دماغ سے کبریائی کا خنّاس نکال دیا جاتا ہے۔ رنگ و نسل اور زبان و وطن کے سارے تعصبات ختم کر کے دُنیا کے ہر گوشے سے آنے والے مسلمانوں کے اندر ایک اُمّت ہونے کا احساس اِس قوت کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے کہ اُس کا اثر کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ دُنیا کے کسی مذہبی اور کسی لامذہبی گروہ کے پاس بھی اپنے پیروؤں کو اس قدر عالمگیر پیمانے

پر متحد کرنے اور ہر سال اس اتحاد کی تجدید کرتے رہنے کا ایسا کیمیا اثر نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہ صرف اُس خدا کی حکمت کا کرشمہ ہے جس کی وحدت کو مان کر، جس کے رسولؐ اور جس کی کتاب کی پیروی قبول کر کے، جس کے حضور اپنی جوابدہی کا شعور پیدا کر کے، مسلمان ایک اُمت بنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا مزید فضل یہ ہے کہ اُس نے حج کی اِن برکات کو بھی صرف اُن لوگوں تک محدود نہیں رکھا جو اِس عبادت کے مناسک ادا کرنے کے لیے مرکزِ اسلام میں جمع ہوتے ہیں، بلکہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ موقع پیدا کر دیا کہ حج ہی کے زمانہ میں وہ اپنی اپنی جگہ حاجیوں کے شریکِ حال بن سکیں۔ یہ عیدُالاضحیٰ کی نماز اور یہ قربانی جو اِن تین دنوں کے اندر زمین کے ہر گوشے میں کی جاتی ہے اِسی غرض کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ دُنیا بھر کے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جس روز (یعنی ۹ ذی الحج کو) حج ادا کرنے کے لیے حاجی منٰی سے عرفات کی طرف روانہ ہوتے ہیں، اُسی روز صبح سے وہ ہر فرض نماز کے بعد بآوازِ بلند اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ کا وِرد شروع کر دیں، اِن تکبیرات کا سلسلہ مزید چار روز تک جاری رکھیں تاکہ منٰی میں حاجیوں کے قیام کا پورا زمانہ دُنیا میں اِن تکبیرات کو بلند کرتے ہوئے گزر جائے۔ عیدُالاضحیٰ کی نماز کے لیے وہی دسؔ ذی الحج کی تاریخ رکھی گئی ہے جو حاجیوں کے لیے یومُ النّحر (قربانی کا دن) ہے۔ حکم ہے کہ اِس نماز کے لیے جاتے وقت بھی اور واپس ہوتے وقت بھی یہی تکبیرات بلند کی جائیں۔ اسی دن ساری دُنیا میں نمازِ عید کے بعد وہی قربانیاں شروع ہو جاتی ہیں جو منٰی میں حاجی کرتے ہیں۔ اِس طرح دُنیا کا ہر مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ میں اُسی اُمت کا ایک فرد ہوں جس اُمت کے لاکھوں آدمی اِس وقت حج کر رہے ہیں، اور حج کے پورے زمانے میں وہ تکبیرات کہتے ہوئے، نماز پڑھتے ہوئے اور قربانی کرتے ہوئے گویا حاجیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ عیدالاضحیٰ میں اگرچہ حج جیسا عظیم اور عالمگیر اجتماع نہیں ہوتا، مگر اپنے اپنے مقام پر مسلمان ہر جگہ بڑے سے بڑا اجتماع کر کے نماز ادا کرتے ہیں، اور مجموعی طور پر تمام روئے زمین پر ایک ہی زمانے میں اِس عید کا منایا جانا ایک دوسرے انداز میں عالمگیر وحدت کا مظاہرہ بن جاتا ہے۔

اختصار کے ساتھ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، اِس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توحید، رسالت، کتاب اور آخرت کے عقائد سے وہ بنیاد فراہم کر دی جس پر قوم، وطن، رنگ، زبان اور نسل کے تمام تعصبات ختم کر کے دنیا کے سارے انسان ایک عالمگیر اُمت بن سکتے ہیں۔ پھر عبادات کے ایسے طریقے مقرر

فرمادیے جو اس اُمت میں محض وحدت ہی نہیں بلکہ پاکیزہ وحدت، اور سطحی و ناپائیدار وحدت نہیں بلکہ نہایت مضبوط عملی وحدت پیدا کرتے ہیں۔ اور اس پر مزید یہ کہ اپنے آخری رسولؐ اور اپنی آخری کتاب کے ذریعہ سے اُس نے وہ مکمل نظامِ زندگی عطا فرمادیا جو پوری انسانیت کے لیے ہر زمان و مکان میں ایسا جامع قانون ہے کہ اپنی کسی ضرورت کے لیے بھی کسی جگہ اور کسی دَور کے انسانوں کو ہدایت کی طلب میں کسی دوسرے ذریعۂ رہنمائی کی طرف رجوع کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

اب اس کے بعد اس سے بڑی بدقسمتی، اور شرمناک بدقسمتی کیا ہوگی کہ جس اُمت کو اللہ تعالٰے نے ایسا جامع و مکمل نظامِ حیات دیا، جس اُمت کی وحدت کو قائم رکھنے کے لیے اُس نے اتنا بڑا انتظام کیا، اور جس اُمت کے سپرد اُس نے یہ کام کیا کہ وہ دُنیا میں اس دینِ توحید کو پھیلائے تاکہ پوری انسانیت اس پر جمع ہو جائے، وہ اپنے اصل کام کو پسِ پشت ڈال کر اپنی اِس وحدت ہی کے ٹکڑے اڑا دینے پر تُل گئی ہے۔ وہ مامور تو اس خدمت پر تھی کہ دُنیا سے اُن اسباب کو ختم کر دے جن کی وجہ سے انسان انسان کو طبیچ سمجھتا ہے، اچھوت سمجھتا ہے، قابلِ نفرت سمجھتا ہے، حقیر و ذلیل سمجھتا ہے، اور خدا کی زمین کو ظلم و ستم اور قتل و غارت سے جہنّم بنا دیتا ہے۔ اُس کا مشن تو یہ تھا کہ دُنیا کو ایک خدا کی بندگی، ایک قانونِ برحق کی پیروی، اور ایک عالمگیر برادری میں جمع کر کے ظلم کی جگہ عدل، جنگ کی جگہ امن، نفرت و عداوت کی جگہ خیر اندیشی و محبت قائم کرے اور نوعِ انسانی کے لیے اُسی طرح رحمت بن جائے جس طرح اس کے ہادی و رہنما محمد صلی اللہ علیہ وسلم رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِین بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ اپنی قوتیں آپس کے تفرقے برپا کرنے پر صرف کر رہی ہے۔ اس کے لیے سب سے دلچسپ مشغلہ یہ بن گیا ہے کہ اس کے افراد اور گروہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں، اور مخالفت کو بڑھا کر نفرت و عداوت کی حد تک لے جائیں۔ نیک نیتی کے ساتھ رائے اور علم و تحقیق کا اختلاف تو رحمت بن سکتا ہے اور سلفِ صالحین میں وہ رحمت ثابت بھی ہوا ہے۔ لیکن اب اس اُمت میں اختلاف کے معنی مخالفت کے ہو گئے ہیں، اور کسی سے کسی مسئلے پر اختلاف ہو جانے کا مطلب یہ ہو گیا ہے کہ آدمی پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ جائے، یہاں تک کہ اُس کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے۔ اور جو کہیں اختلاف مذہبی نوعیت کا ہو جائے تو پھر اُسے جہنّم کے دروازے تک پہنچائے بغیر دم لینا حرام ہے۔ اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جن کے لیے وحدت کا اتنا بڑا سامان کیا تھا اُن کے لیے اب تفرقے کے سارے دروازے کھل گئے ہیں اور وحدت

کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ مل کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ مسجدیں الگ ہوگئی ہیں۔ ایک مسجد میں دوسرے مسلک کا آدمی نماز پڑھ لے تو وہ جگہ ناپاک ہو جاتی ہے جہاں اُس نے نماز پڑھی ہو۔ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے آدمی سے مصافحہ تک کرنے سے اجتناب کرتا ہے کہ کہیں اس کا ہاتھ گندا نہ ہو جائے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ سب کچھ اُسی چیز کا نتیجہ ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں کہ مختلف لوگوں نے توحید اور دین و شرع میں نئی نئی چیزوں کی آمیزش کی ہے، اصل دین کے عقائد و احکام میں کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا ہے، جو چیزیں اہم نہ تھیں انہیں اہم ترین بنایا ہے اور جو اہم تھیں انہیں غیر اہم بنا دیا ہے اور پھر انہی آمیزشوں اور اسی کمی و بیشی کو مدارِ ایمان قرار دے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت کے مختلف گروہ آپس ہی میں برسرِپیکار ہوگئے ہیں۔ اِس حالت میں ہدایت سے بیگانہ انسانوں کو حق کی دعوت دے کر اس عالمگیر برادری میں شامل کرنا تو الگ رہا، جو اِس برادری میں پہلے سے شامل ہیں خود انہیں بھی اس سے خارج کرنے کا کام کارِ ثواب سمجھ کر انجام دیا جارہا ہے۔ اس صورتِ حال نے ہمیں غیر مسلموں کے لیے ایک تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور مُستشرقین کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی ہے کہ یہ اُمت سرے سے کوئی اُمت ہی نہیں ہے۔ اِس وقت اشاعتِ اسلام کی راہ میں اگر کوئی سب سے بڑی رکاوٹ ہے تو وہ ہماری یہی حالت ہے۔ خدا ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں راہ راست دکھائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

تصحیحِ اغلاط

ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی میں حسبِ ذیل غلطیوں کی اصلاح کر لی جائے۔

صفحہ ۴۴۳، سطر ۹ کی موجودہ عبارت: " اور فرعون اور ہم نے اِس کی قوم " کو کاٹ کر اُس کی جگہ یہ عبارت لکھی جائے: " اور ہم نے فرعون اور اُس کی قوم "۔

صفحہ ۵۵۸، آیت ۶۰ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ کے بجائے وَلٰکِنَّ اَکْثَرُھُمْ لکھا جائے۔

صفحہ ۶۱۴، آیت ۲۴ میں مِنْ عِبَادِنَا کے بجائے مِنْ عِبَادِنَا لکھا جائے۔

رسائل و مسائل

(۱) کیا معاشی وجوہ سے منع حمل صحیح ہے؟

(۲) کیا حضرت آدمؑ کے جسم کی ساخت موجودہ انسان جیسی تھی؟

سوال: عرض یہ ہے کہ میں اپنے ایک عزیز کے دو اعتراضات کا جواب تسلی بخش طور پر نہ دے سکا۔ از راہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔ اعتراضات یہ ہیں:۔

۱۔ "مولانا نے قرآن مجید کی آیت: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۳۱) کی تفسیر میں انصاف سے کام نہیں لیا اور اِس آیت کی تفسیر میں اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لحاظ سے مفہوم نکالا ہے۔ کیونکہ آیت میں قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور قتل اُسی کو کیا جا سکتا ہے جس میں جان ہو، جب کہ جان اس جرثومے میں اُسی وقت پڑتی ہے جب رحم مادر میں دو مخالف جرثوموں کا ملاپ واقع ہوتا ہے اور ایک جاندار شے وجود میں آتی ہے۔ چونکہ افزائش نسل کو روکنے کے طریقے عام طور پر مذکورہ ملاپ سے پہلے ہی عمل میں آجاتے ہیں لہٰذا اُس چیز کا قتل کیا معنی جس کا وجود یا جاندار ہی نہ ہو۔"

۲۔ "ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مخالفین نے اِس نظریہ کی مخالفت محض اس تصور اور عقیدے کی بنا پر کی ہے کہ انسان آدمؑ کی اولاد ہے۔ اگرچہ یہ عقیدہ درست سہی، لیکن آپ کے پاس اس بات کو جاننے کا کونسا مستند ذریعہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے جسم کی ساخت و بناوٹ وہی رہی ہوگی جو کہ موجودہ انسان کی ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جس شکل میں پیدا کیا ہو وہ ڈارون کے نظریہ کے مطابق ہی ہو (یعنی اُس وقت کا انسان UNI - CELLULAR ہو)، صرف فرق اتنا ہی ہو کہ آپ سے آپ وجود میں نہ آیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آیا ہو اور بتدریج

ترقی کرتا ہوا موجودہ انسان کی شکل کو پہنچا ہو۔"

جواب:۔ آپ نے اپنے عزیز کے جو اعتراضات پیش کیے ہیں اُن کا جواب درج ذیل ہے:

۱۔ آپ کے عزیز نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۱ کو بغور نہیں پڑھا بلکہ جو خیالات اُن کے ذہن میں پہلے سے جمے ہوئے تھے اُنہی کی بنیاد پر آیت سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اِس میں صرف قتلِ اولاد سے منع کیا گیا ہے۔ حالانکہ اِس آیت میں قتلِ اولاد کو بڑی خطا قرار دینے کے ساتھ اُس کے محرّک، یعنی خوفِ افلاس، کو بھی غلط قرار دیا گیا ہے، اور ساتھ ہی یہ الفاظ کہہ کر کہ "ہم اُنہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی"، اِس امر کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ خوفِ افلاس، جو قتلِ اولاد کا محرّک بنتا ہے، دراصل خدا کی رزّاقی پر عدمِ اعتماد ہے، ورنہ یہ اعتماد موجود ہو تو نہ افلاس کا خوف تمہیں لاحق ہوگا اور نہ تم اولاد کو قتل کرو گے۔ اِسی بات کی تشریح میں نے اپنے حاشیے میں کی ہے جس پر غور کرنے کی زحمت آپ کے اِن عزیز نے نہیں اُٹھائی۔ اُس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ حمل کو روکنا قتلِ اولاد ہے، بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ جو خوفِ افلاس پہلے قتلِ اولاد اور اسقاطِ حمل کا محرّک ہوتا تھا وہی اب ضبطِ ولادت کی تحریک کا محرّک بنا ہوا ہے، اِس لیے معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائشِ نسل کا سلسلہ روک دینا بھی اِس آیت کی رُو سے غلط ہے۔

۲۔ آپ کے عزیز مجھے معاف کریں اگر میں یہ کہوں کہ وہ قرآن سے زیادہ ڈارون کے معتقد ہیں۔ اِسی وجہ سے انہوں نے تخلیقِ آدم کے متعلق قرآن کے تمام بیانات کو نظر انداز کر کے ڈارون کی رائے کے مطابق حضرت آدمؑ کا واحدُ الخَلیّۃ سالمہ (UNI - CELLULAR MOLECULE) ہونا (از راہِ مہربانی صحیح قرار دینے سے احتراز کرتے ہوئے صرف) "ممکن" ٹھہرایا ہے، اور مجھ سے سوال کیا ہے کہ آخر تمہارے پاس یہ جاننے کا کونسا مستند ذریعہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے جسم کی ساخت ویسی ہی تھی جیسی موجودہ انسان کی ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ اگر صاحبِ موصوف کے نزدیک قرآن مجید علم کا کوئی مستند ذریعہ نہیں ہے تو اُن سے بحث لاحاصل ہے، کیونکہ محض عقلی حیثیت سے آدمؑ کے جسم کی ساخت کا موجودہ انسان کی ساخت جیسا ہونا بھی اُسی طرح "ممکن" ہے جس طرح اُس کا واحدُ الخَلیّۃ سالمہ ہونا ممکن ہے۔ امکان میں جب دونوں برابر ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی "مستند ذریعۂ علم" نہیں ہے تو خواہ مخواہ بحث میں کیوں وقت ضائع کیا جائے؟ لیکن اگر وہ قرآن کو

علم کا مستند ذریعہ مانتے ہوں تو تھوڑی سی زحمت اٹھا کر سورۂ بقرہ، آیات ۳۰ تا ۳۹، سورۂ اعراف، آیات ۱۱ تا ۲۵، سورۂ حِجر، آیات ۲۶ تا ۴۲، سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۶۱ تا ۶۵، اور سورۂ طٰہٰ، آیات ۱۱۵ تا ۱۲۳ بغور پڑھیں اور ڈارون کے نظریے کو نگاہ میں رکھ کر پڑھیں۔ کیا اُن کی عقل یہ تصوّر کر سکتی ہے کہ قرآن کی اِن آیات میں جو کچھ حضرت آدمؑ کے متعلق بیان کیا گیا ہے وہ ایک واحِدُ الخَلِیَّہ سلسلے پر راست آتا ہے؟

اِس کے ساتھ میں ایک بات اور بھی آپ کے عزیز سے کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر وہ قرآن کو علم کا مستند ذریعہ نہ سمجھتے ہوں تو اُن کی اپنے ضمیر اور اپنے اخلاق اور اپنے معاشرے کے ساتھ اس سے بڑی کوئی بے انصافی نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کریں۔ ایک راستباز انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ سچے دل سے تو اسلام کا قائل نہ ہو مگر اِس کا صاف صاف اظہارو اقرار کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل رکھ کر مسلسل فریب دہی کا ارتکاب کرتا ہے۔

کیا کافر عمل صالح پر اجر کا مستحق ہے؟

سوال:۔ گذارش ہے کہ اس بندۂ عاجز کے ایک مخلص دوست جو دینی خیال کے آدمی ہیں، اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو شخص بھی اپنے رب کی رضا کے لیے کوئی نیک عمل کرے، مثلاً مظلوم کی حمایت، غریب کی امداد، مسافر کی خدمت، کسی بیمار کی تیمارداری، تو وہ اپنے رب کے ہاں ضرور اجر پائے گا۔ آخرت کی اجارہ داری مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں۔ اللہ رب العالمین ہے صرف مسلمانوں کا خدا نہیں۔ ان کا گمان ہے کہ ہر مذہب کا پیرو مثلاً عیسائی، ہندو، بدھ وغیرہ، اگر خالص نیت سے نیکی کرے، یعنی ریاکاری مقصود نہ ہو تو وہ آخرت میں جزا پائے گا۔ میں ان سے متفق نہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کا حوالہ دیتا ہوں کہ ایمان لانا بھی قبولیت عمل کے واسطے شرط ہے۔ مثلاً سورہ نحل، ۹۷۔ سورہ طٰہٰ، ۱۱۲، سورۂ انبیاء، ۹۴۔ مگر وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ میں نے ان سے عرض کیا تمام علماء اس بات پر متفق ہیں۔ انھوں نے جواب دیا علماء عموماً انتہا پسند ہیں، پھر وہ آپ کے متعلق کہنے لگے کہ مولانا مودودی صاحب متوازن ذہن کے عالم ہیں اور ان کی سوچ انتہا پسندانہ نہیں۔ آپ اس مسئلہ کا فیصلہ ان سے پوچھ دیجیے چنانچہ

یہ عریضہ ارسالِ خدمت ہے۔ وضاحت کے لیے ایک اور بات لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر ایک فاسق مسلمان نیکی کرے تو وہ قبول، اور وہی نیکی یا اس سے بہتر نیکی اگر ایک غیر مسلم کرے تو وہ مسترد۔ اللہ ایسا جانبدار نہیں ہوسکتا۔ یہ اس کی شانِ بندہ پروری کے خلاف ہے۔

جواب: آپ کے دوست اگر اِس مسئلے کا جواب قرآن سے چاہتے ہیں تو وہ اِس باب میں بالکل صریح ہے کہ کافر کے اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے، وہ محض اپنے کفر کی بنا پر عذابِ جہنم کا مستحق ہے۔ آپ نے سورۂ نحل، سورۂ طٰہٰ اور سورۂ انبیاء کی جو آیات اُن کو سُنائی ہیں وہ اگر انھیں مطمئن نہیں کرسکیں تو اُن سے زیادہ صریح اور مفصل آیات قرآن میں موجود ہیں جو پوری وضاحت کے ساتھ یہ بتاتی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں اور اس کی آیات اور روزِ آخرت پر، یا ان میں سے کسی ایک پر ایمان نہ لانے والے کافر ہیں اور آخرت میں ان کے لیے جہنّم کا عذاب ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء آیات ۱۵۰-۱۵۱ ملاحظہ فرمایئے جن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا۔

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور (کفر و ایمان کے) بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کُن عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔

اِس ارشاد کی رُو سے خدا اور رسولوں کو نہ ماننا، یا خدا کو ماننا اور رسولوں کو نہ ماننا، یا رسولوں میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا، اِن میں سے ہر ایک قطعی کُفر ہے اور کُفر کی سزا (عمل سے قطعِ نظر) رسوا کُن عذاب ہے۔

پھر سورۂ انعام، آیت ۱۳۰ دیکھیے۔ اُس سے پہلے کی آیات میں شیاطین اور اُن کی پیروی کرنے والوں کے لیے ہمیشگی کے عذاب کا فیصلہ سُنانے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ جِن و انس

سے خطاب کر کے فرمائے گا:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۔ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا ۔ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۔

"کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس رسول خود تم میں سے جو سناتے تھے تم کو میری آیات اور ڈراتے تھے تم کو یہ دن دیکھنے سے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔ ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا اور انہوں نے آخر کار خود اپنے اوپر گواہی دی کہ ہم کافر تھے"۔

یہاں رسولوں کی بات نہ ماننے اور اُن کی پیش کردہ آیاتِ الٰہی پر ایمان نہ لانے اور آخرت کو تسلیم نہ کرنے والے لوگوں کو کافر قرار دیا گیا ہے اور اُنہی کو ہمیشگی کے عذابِ جہنم کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے، بلا لحاظ اس کے کہ اُن کے عمل کیسے تھے اور کیسے نہ تھے۔

یہی بات سورہ زُمر آیات ۷۱، ۷۲ میں فرمائی گئی ہے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ جب کافر جہنّم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے تو اُن کے لیے جہنّم کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اُس کے کارندے (فرشتے) ان سے پوچھیں گے:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۔ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۔

"کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس رسول خود تم میں سے جو سناتے تھے تم کو تمہارے رب کی آیات اور ڈراتے تھے تم کو یہ دن دیکھنے سے؟ وہ کہیں گے ہاں، مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چسپاں ہو گیا۔ کہا جائے گا داخل ہو جاؤ جہنّم کے دروازوں میں یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے"۔

یہاں بھی اُن لوگوں کو کافر قرار دیا گیا ہے جنہوں نے دنیا میں رسولوں اور ان کی پیش کردہ آیات، اور آخرت پر ایمان لانے سے انکار کیا تھا۔ انہی لوگوں کے حق میں ہمیشگی کے عذابِ جہنّم کا فیصلہ سنایا گیا ہے۔ اِس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ کفر کے سوا اُن کے کچھ اور گناہ تھے یا نہ تھے جن کی بنا پر وہ عذابِ جہنّم کے مستحق ہوتے یا نہ ہوتے۔

اس کے بعد سورۂ ملک کی آیات ۸ تا ۱۱ دیکھیے جس میں صرف انبیاء اور اُن پر نازل ہونے والی کتابوں کے انکار کو عذابِ جہنّم کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ - قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ -

"جب بھی کوئی انبوہ اُس میں (یعنی جہنّم میں) ڈالا جائے گا، اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے کیا کوئی خبردار کرنے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں، ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا، مگر ہم نے جھٹلا یا اور کہا کہ خدا نے کچھ نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو"

اِن آیات کو دیکھنے کے بعد کیا کوئی شخص جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو، یہ ماننے سے انکار کر سکتا ہے کہ کُفر بجائے خود انسان کے جہنّمی ہونے کا مستقل سبب ہے، اور کُفر کے ساتھ کوئی نیک عملی بھی اُس کو جہنّم سے نہیں بچا سکتی؟ البتہ فرق اگر ہے تو صرف اِس لحاظ سے ہے کہ اُس دار العذاب کے دروازے بہت سے ہیں۔ اچھے کام کرنے والا کافر کسی اور دروازہ سے داخل ہوگا اور بُرے کام کرنے والے کفار اپنے بُرے اعمال کے مطابق مختلف دروازوں سے داخل ہوں گے۔ بالفاظ دیگر کسی کے لیے عذاب ہلکا ہوگا اور کسی کے لیے سخت اور کسی کے لیے سخت سے سخت۔ اعمال صرف عذاب کے خفیف یا شدید ہونے کے موجب تو بن سکتے ہیں، لیکن جہنّم میں جانے سے کوئی کافر نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ کفر خدا سے بغاوت ہے، اور باغی کے لیے اللہ نے اپنی جنت نہیں بنائی ہے۔

رہے مومن تو وہ دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ایمان کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی صالح ہوں۔ ان کے اگر کچھ قصور ہوں بھی تو وہ توبہ سے معاف ہو سکتے ہیں، دُنیا کے مصائب، امراض، تکالیف بھی اُن کا کفارہ بن سکتی ہیں، شفاعت بھی ان کے حق میں نافع ہو سکتی ہے، اور اللہ اپنے فضل و کرم سے بھی اُن کی مغفرت فرما سکتا ہے۔ دوسری قسم کے مومن وہ ہیں جو ایمان رکھنے کے باوجود بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں۔ وہ باغی نہیں بلکہ مجرم ہیں۔ ان کے لیے اگر کوئی چیز بھی بخشش کی موجب نہ بن سکتی ہو، تو انہیں بغاوت کی نہیں بلکہ جرم یا جرائم کی سزا دی جائے گی۔ دُنیا کے قوانین بھی باغی

اور مجرم کو ایک سطح پر نہیں رکھتے۔ پھر آپ احکم الحاکمین سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں کو ایک سطح پر رکھے گا؟

شہداء کی حیاتِ برزخ

سوال:۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۵۴ حاشیہ ۱۵۵ تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۲۶ میں، اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مُردہ نہ کہنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے رُوحِ جہاد سرد پڑتی ہے۔ اسی نوٹ میں آگے چل کر یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ انہیں مُردہ کہنا حقیقتِ واقعہ کے بھی خلاف ہے۔ لیکن پورے نوٹ کو پڑھنے سے پہلے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رُوحِ جہاد کے سرد نہ ہونے کی غرض سے انہیں مُردہ نہ کہنا چاہیے۔

۲۔ سورۃ "المومن" آیت ۴۱ - ۵۰ تک کا ترجمہ جلد دوم میں صفحہ ۲۸۳ سے ۲۸۷ تک چلتا ہے۔ قرآن کا متن جو تفہیم القرآن میں شائع ہوا ہے اس میں صفحہ ۲۸۷ پر یُسَارِعُوْنَ کا لفظ آتا ہے، لیکن اس کا ترجمہ صفحہ ۲۸۳ پر ہی کر دیا گیا ہے۔ اکثر پڑھنے والوں کو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ چونکہ اصل لفظ اور ترجمہ میں چار صفحات کا فاصلہ ہے اس لیے پڑھنے والے کا ذہن اُلجھ جاتا ہے۔

۳۔ سورۃ یٰسٓ آیت ۲۶ حاشیہ ۲۳ تفہیم القرآن جلد چہارم میں مردِ مومن کی شہادت کے بعد اس کے اعزاز کا ذکر کرتے ہوئے نوٹ میں کہا گیا ہے کہ حیاتِ برزخ کو ثابت کرنے والی آیات میں سے یہ آیت بھی ایک ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عالمِ برزخ میں رُوح جسم کے بغیر زندہ رہتی ہے، کلام کرتی ہے اور کلام سُنتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے، اور اہلِ دنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔ اس پر اکثر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس مقام میں تو ایک شہید کی حالت کا ذکر ہے اور شہید کی زندگی بعد موت کا ذکر قرآن میں سورۃ بقرہ آیت ۱۵۴ اور دیگر مقامات میں بھی ہے۔ لیکن تفہیم کے اس حاشیے میں ایک شہید کے حالات کو بھی عام وفات یافتہ انسانوں پر کیوں منطبق کیا گیا ہے؟

جواب: سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ کے جس نوٹ کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے اس میں "مُردہ نہ کہو" کی

جو توجیہ میں نے کی ہے اس سے مقصود حیاتِ شہداء و صالحین کے متعلق لوگوں کے اِس خیال کی اصلاح ہے کہ وہ زندہ اِس معنی میں ہیں کہ ہماری دُعائیں سُنتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مُردہ کہنے سے جس بنا پر روکا ہے اور ان کی حیات کا اثبات کیا ہے وہ کفار و منافقین کی اُن باتوں کو رد کرنے کے لیے ہے جو وہ لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا اور لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا کہہ کر اہلِ ایمان میں بزدلی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ورنہ خود قرآن ہی میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ شہادت جسمانی موت تو ضرور ہے (وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ) مگر حقیقت میں یہ حیاتِ جاوداں ہے (بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ)۔ اسی معنی میں میں نے بھی انہیں مُردہ کہنے کو حقیقتِ واقعہ کے خلاف قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے لیے حیاتِ بَرزخ اور حیاتِ اُخروی ثابت ہے۔

سورۂ مومنون کی آیات ۵۰ تا ۶۱ کے ترجمے میں آپ نے جس تقدیم و تاخیر کی طرف توجہ دلائی ہے، اس کے متعلق بعد کے ایڈیشنوں میں حاشیہ ۵۰ الف لکھ کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ اُردو زبان کی رعایت سے آیت ۶۱ کا ترجمہ پہلے کر دیا گیا ہے اور آیات ۵۰ تا ۶۰ کا ترجمہ بعد میں درج کیا گیا ہے۔

سورۂ یٰسٓ کے حاشیہ ۲۳ کو اگر آپ سورۂ بقرہ کے حاشیہ ۱۵۵ اور سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۵۸ کے ساتھ پڑھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شہداء کی حیات اصل میں برزخی حیات ہی ہے، ورنہ جسم و رُوح کی علٰحدگی کے اعتبار سے جس طرح دوسرے لوگوں پر موت وارد ہوتی ہے اُسی طرح شہدا پر بھی وارد ہوتی ہے۔ اِسی لیے ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیوہ کا نکاحِ ثانی جائز ہے لیکن ان کو مُردہ کہنے سے جس بنا پر منع کیا گیا ہے وہ اُوپر میں بیان کر چکا ہوں۔

ایک صریح جھوٹ

سوال:- کراچی سے شائع ہونے والے ایک ادبی ماہنامہ "افکار" دسمبر ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں ریاض صدیقی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "قائدِ اعظم - ایک عہد ساز شخصیت" شائع ہوا ہے۔ اِس مضمون کی آخری سطور میں صاحبِ مضمون نے "جماعتِ اسلامی اور قائدِ اعظم" کے ذیلی عنوان سے لکھا ہے:

"قائدِ اعظم نے ۱۹۳۹ء میں راجہ صاحب محمود آباد اور قمر الدین کو اختیار دیا تھا کہ وہ مولانا مودودی

اور علامہ عنایت اللہ مشرقی کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دیں۔ مسلم لیگ کا جلسہ ہونے والا تھا۔ قمرالدین نے اس مسئلے پر مولانا مودودی سے رابطہ قائم کیا۔ مودودی نے مسلم لیگ کے جلسہ میں شرکت اس شرط پر منظور کی کہ قائداعظم اپنے دستخطوں سے ان کے نام دعوت نامہ جاری کریں۔ اس وقت تک مسلم لیگ میں رسمی دعوت ناموں کے اجرا کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ تاہم قمرالدین فوراً دہلی گئے اور کسی نہ کسی طرح مطلوبہ دعوت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مولانا مودودی دعوت نامہ کے باوجود مسلم لیگ کے جلسے میں شریک نہیں ہوئے اور قدرے تلخی کے ساتھ معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں کسی نام نہاد جماعت سے تعلق قائم کرنا پسند نہیں کرتا جو اسلام کی نمائندہ جماعت نہ ہو۔ مسلم لیگ میں شرکت کرنے والے محض نام کے مسلمان ہیں اور میں اس بے معنی سیاسی ہنگامے سے متعلق ہو کر اپنی شخصیت کو کھونا نہیں چاہتا۔" (افکار۔ کراچی شمارہ دسمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۲)

ایک ایسا شخص جو آپ کے فکر اسلامی اور تحریک اسلامی سے متاثر ہو کر آپ کی شخصیت سے دلی تعلق رکھتا ہے اور آپ کے افکار اور شخصیت پر اپنے طور پر قلمی کام بھی کر رہا ہے استدعا کرتا ہے کہ ان امور کی وضاحت کر کے ممنون فرمائیں:

۱۔ کیا واقعی ایسا دعوت نامہ طلب کیا گیا؟

۲۔ کیا مذکورہ دعوت نامہ مہیا کر دیا گیا؟

۳۔ دعوت نامہ مہیا ہونے کی صورت میں کیا واقعی تلخی کے ساتھ معذرت کا اظہار کیا گیا؟

جواب: آپ کے مفصل سوال کا نہایت مختصر جواب یہ ہے کہ ماہنامہ افکار کراچی کی جو عبارت آپ نے نقل کی ہے اس کا ایک لفظ بھی سچ نہیں ہے۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کس جرأت کے ساتھ جھوٹ لکھتے اور اسے پھیلاتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ کوئی آخرت بھی ہے جہاں جا کر انہیں اپنی ان افترا پردازیوں کی جواب دہی کرنی ہو گی۔

کیا حنفیوں کے مقدمات کا کسی دوسری فقہ پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟

سوال: اگر حنفی اور شافعی نقطۂ نظر کے درمیان اختلاف ہو تو کیا یہ ضروری ہے کہ حنفیوں کے معاملے میں صرف حنفی نقطۂ نظر ہی قبول کیا جائے؟ اور خاص کر جہاں عدالت اس رائے پر پہنچے کہ شافعی نقطۂ نظر زیادہ وزن دار ہے؟

جواب: ۱۔ اس سوال کے دو پہلو ہیں۔ ایک اصولی، دوسرا عملی۔

اصولی حیثیت سے اگر قاضی کسی مسئلے کی تحقیق کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ اس خاص مسئلے میں حنفی مذہب کی بہ نسبت شافعی یا مالکی یا حنبلی مذہب کے دلائل کتاب و سنّت کی رو سے زیادہ مضبوط ہیں تو وہ نہ صرف اُس کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہے بلکہ راجح مذہب کو چھوڑ کر مرجوح مذہب پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن عملی حیثیت سے اس میں چند در چند مشکلات ہیں۔

اوّل تو ہمارے ملک میں دوسرے مذاہب کی مبسوط کتابیں نہیں ملتیں جن سے اُن کے دلائل پوری طرح معلوم کیے جاسکیں اور ایک مسئلے سے تعلق رکھنے والے تمام وہ جزئیات سامنے آجائیں جنھیں کسی دوسرے مذہب کے مطابق فیصلہ کرتے ہوئے ملحوظ رکھنا چاہیے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ احادیث اور اُن کی شرحوں اور اسماء الرجال کا پورا ذخیرہ کسی عدالت کی لائبریری یا کسی پبلک لائبریری یا کسی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود نہیں ہے تاکہ ایک مذہب کی فقہی کتابیں جن روایات کے حوالے دیتی ہیں ان کے درست یا نادرست ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے اصل مآخذ سے رجوع کیا جاسکے۔

تیسری مشکل یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تمام کتابیں عربی زبان میں ہیں اور ہمارے ملک کے حکام عدالت اور وکلاء، خواہ وہ عربی زبان سے بحیثیت زبان بخوبی واقف بھی ہوں، اُنھوں نے اُس خاص زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے جو فقہ، اصول فقہ، حدیث اور اصولِ حدیث میں استعمال ہوتی ہے۔ ان مضامین کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے محض عربی زبان کا علم کافی نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کے لا کالجوں میں اسلامی قانون کی کماحقہ تعلیم کا اب تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔

آخری مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی عدالتِ عالیہ تحقیق کا حق ادا کر کے حنفی مذہب کے بجائے کسی دوسرے مذہب کے مطابق فیصلہ کر دے تو یہ ماتحت عدالتوں کے لیے ایک اصولی نظیر بن جائے گی اور اجتہادی اہلیت کے بغیر دوسرے مذاہبِ فقہ کے مطابق فیصلے کرنے کا دروازہ کھل جائے گا۔ ہمارے ملک کی عام آبادی حنفی ہے، اور یہاں کے علماء اسی مذہب سے واقف ہیں، بلکہ اس مذہب کی پیروی کے سخت پابند ہیں۔ اس لیے نیم پختہ علم کی بنا پر جب چھوٹی عدالتوں سے حنفی فقہ کے خلاف فیصلے صادر ہونے لگیں گے تو اس پر ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔

ان تمام باتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے میں یہ مشورہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

غرق ہونے والے فرعون کی لاش

سوال: ۔ اگر تھوڑی سی فراغت ہو تو از راہِ کرم اَلْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ (یونس، آیت ۹۲) کے سلسلے میں میری ایک دو اُلجھنیں دُور فرمائیے۔ علامہ جوہری طَنطاوی مصری اِس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ بحیرۂ احمر میں ڈوبنے والے فرعون کی لاش سنہ ۱۹۰۰ میں مل گئی تھی اور مُفتّش نے کئی شواہد کی بنا پر اعلان کیا تھا کہ یہ لاش اُسی فرعون کی ہے۔ لیکن علامہ نے اُن شواہد کا ذکر نہیں کیا۔ آپ نے صرف ایک شہادت یعنی سمندری نمک کا ذکر فرمایا ہے جو فرعون کے بدن پہ پایا گیا تھا۔

اگر آپ کو باقی شہادتوں کا علم ہو، یا کوئی ایسی کتاب معلوم ہو جس میں اِن شواہد کا ذکر ہو تو از راہِ کرم مطلع فرمائیں۔

آپ نے فرعون کے جسم پر سمندری نمک کا ذکر فرمایا ہے۔ کیا اُس کی ممی حنوط شدہ نہیں تھی؟ اگر تھی تو سمندری نمک کیسے باقی رہ گیا تھا؟

کیا یہ نعش کسی ہَرم سے ملی تھی یا معمولی قبر سے؟ اور یہ مقام کہاں ہے؟ قاہرہ سے کس طرف ہے اور کتنا دُور ہے؟

جواب: ۔ غرق شدہ فرعون کے بارے میں زیادہ تر معلومات مجھے LOUIS GOLDING کے سفرنامے IN THE STEPS OF MOSES THE LAWGIVER سے حاصل ہوئی ہیں۔ اس نے اپنے اِس تحقیقاتی سفرنامے میں لکھا ہے کہ فرعون رعمسیس دوم دراصل وہ فرعون تھا جس کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اور بنی اسرائیل پر جس کے مَظالم مشہور و معروف ہیں۔ اسی لیے اس کو PHARAOH OF THE PERSECUTION کہا جاتا ہے۔ اور جس فرعون کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے اور جو بحر احمر میں غرق ہوا وہ رعمسیس کا بیٹا MENEPTAH تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کا نام MERNEPTAH لکھا گیا ہے)۔ گولڈنگ کی کتاب اور برٹانیکا کے مضمون EGYPT دونوں میں لکھا ہے کہ تھیبس THEBES میں اُس کے MORTUARY TEMPLE سے ایک ستون سنہ ۱۸۹۶ء میں FLINDERS PETR:C کو ملا تھا جس پر اُس نے اپنے عہد کے کارنامے گنائے تھے۔ اُسی ستون میں پہلی مرتبہ مصر میں اسرائیل کے وجود

کی تاریخی شہادت ملی۔ برٹانیکا کے مضمون MUMMY میں ذکر ہے کہ ۱۹۰۶ء میں انگریز ماہر علم التشریح SIR GRAFTON ELLIOT SMITH نے میموں کو کھول کھول کر ان کے حنوط کی تحقیق شروع کی تھی اور ۴۴ میموں کا مشاہدہ کیا تھا۔ گولڈنگ لکھتا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں اسمتھ کو منپتہ کی لاش ملی جس کی پٹیاں جب کھولی گئیں تو سب حاضرین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُس کے جسم پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی تھی جو کسی اور ممی کے جسم پر نہیں پائی گئی۔ گولڈنگ مزید یہ بات بھی بیان کرتا ہے کہ یہ فرعون بُحَیراتِ مُرّہ (BITTER LAKES) میں غرق ہوا تھا جو اُس زمانے میں بحر احمر سے ملی ہوئی تھیں۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی ہے جسے مقامی لوگ جبلِ فرعون کہتے ہیں۔ اُس پہاڑی کے نیچے ایک غار میں نہایت گرم پانی کا چشمہ ہے جسے لوگ حمام فرعون کہتے ہیں اور سینہ بسینہ منتقل ہونے والی روایات کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اسی جگہ فرعون کی لاش ملی تھی۔

میں ان معلومات سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بُحَیراتِ مُرّہ میں ڈوبنے کے بعد اُس کی لاش کے پھول کر سطح سمندر پر تیرنے اور حمام فرعون تک پہنچنے میں کافی وقت لگا ہوگا جس کے دوران میں اُس کے گوشت پوست میں سمندری پانی کا نمک جذب ہو گیا ہوگا۔ یہ نمک اُس کی لاش کو حنوط کرتے وقت خارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تین ہزار برس کے دوران میں یہ رفتہ رفتہ اس کے جسم سے خارج ہو کر ایک تہ کی صورت میں جم گیا اور جب پٹیاں کھولی گئیں تو نمک اُس پر جما ہوا پایا گیا۔

مطبوعات

دعواتِ حق افادات شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مہتمم دار العلوم عثمانیہ

ضبط و ترتیب : مولانا سمیع الحق صاحب

شائع کردہ : موتمر المصنفین ، دار العلوم ، حقانیہ اکوڑہ خٹک ۔ پشاور۔

صفحات : ۶۷۱ قیمت : ۳۰/- روپے

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، صدر دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مواعظ کا مجموعہ ہے جسے اُن کے فرزندِ ارجمند نے بڑے سلیقے کے ساتھ ترتیب دیا ہے ۔ یہ خطبات اسرارِ عبادات و اخلاق ، اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ ظاہر و باطن کا قابلِ قدر مرقع ہیں ۔ ان خطبات میں تیر و نشتر بھی ہیں اور سوز و گداز بھی اور اندازِ بیان اتنا سہل اور آسان ہے کہ ان سے مسلمانوں کا ہر طبقہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے ۔

یہ خطبات جس عالمِ دین نے دیے ہیں ہم ان کی دینی بصیرت کے اعتراف کے باوجود اُن کے نظریہ عالمِ انسانیت کی تدریجی ترقی صفحہ ۲۴۰ - ۲۴۱ سے اتفاق نہیں کر سکتے ۔ معاشرتی ارتقاء کا یہ نظریہ غلط ہے اور اِس نظریے سے ختمِ نبوت کی دلیل لینا کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ۔ اہلِ مغرب نے تاریخِ انسانی کے مختلف اَدوار کو طفولیت ، بچپن ، شباب ، کہولت میں جو تقسیم کیا ہے تو اس کی تہ میں مادی ترقی کا تصور کار فرما ہے ۔ مسلمان مفکرین کی کس قدر سادگی ہے کہ مادی ترقی کی ان مختلف منازل سے اب وہ نبوت کے مدارج متعین کر رہے ہیں ۔ ہمیں اُمید ہے کہ فاضل خطیب اِس حصّے پر نظرِ ثانی فرما کر اسے درست کر دیں گے ۔

معیارِ کتابت و طباعت عمدہ ہے ۔ زبان میں البتہ جھول ہیں جو دُور ہونے چاہییں ۔

انجمن سازی مصنف ، حفیظ عبد الکریم ۔ ایم اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی (گولڈ میڈلسٹ)

ناشر : کفایت اکیڈمی ۔ آسن مل اوجھا روڈ ۔ مقابل اُردو بازار ۔ کراچی ۔

صفحات : ۱۴۸ قیمت : ۶/- روپے

زیرِ نظر کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ، " انجمن سازی " کے بارے میں ضروری مواد فراہم کرتی

ہے اور اسے فاضل مصنف نے کافی تحقیق اور محنت سے عام فہم زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس میں مختلف انجمنیں بنانے، اُنہیں چلانے، اُن کی رجسٹریشن اور مالی امداد کے حصول کے ذرائع وغیرہ کے بارے میں جملہ قواعد وضوابط درج ہیں۔

انجمن سازی کی ضرورت و اہمیت پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں واضح ہے۔ حکومت کے وسائل محدود اور مسائل گوناگوں ہیں۔ ان حالات میں حکومت ازخود تمام معاشی و معاشرتی مسائل حل نہیں کر سکتی جب تک کہ اُسے ملک کے مختلف معاشی اور سماجی اداروں کا تعاون حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں معاشی و سماجی بہبود کے ادارے عوام کی فلاح میں حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آرٹ کے نام پر معرضِ وجود میں آنے والی ثقافتی انجمنیں ملک و قوم کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے سکتیں بلکہ معاشرہ میں کئی ایک سنگین مسائل کا سبب بنتی ہیں۔

فاضل مصنف نے کتاب میں کئی ایک اصطلاحیں ایسی استعمال کی ہیں جو اُردو میں مستعمل نہیں۔ اس لیے یہ ذوق پر گراں گزرتی ہیں۔

مزدور، سماجی بہبود کے کارکن، عہدیدار اور ایسے تمام دوسرے حضرات جن کو خدمتِ خلق اور رفاہی کاموں سے دلچسپی ہو اِس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتابت وطباعت اعلیٰ ہے اور اِس لحاظ سے قیمت مناسب ہے۔

پاکستان کی موجودہ	تالیف: جناب ثروت جمال اصمعی
اقتصادی صورتِ حال	ناشر: ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی

صفحات: ۸۰ قیمت: -/۲ روپے

موجودہ حکومت کے نشرواشاعت کے وسیع ذرائع ہر آن عوام میں یہ تاثر پھیلا رہے ہیں کہ ملک ہر شعبۂ زندگی میں محیر العقول ترقی کر رہا ہے خصوصاً معاشی ترقی کا تو بڑا پرچار کیا جا رہا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اِس فریب کا پردہ چاک کر کے اِس ملک کے باشندوں کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کرتی ہے۔ فاضل مصنف نے قومی معیشت کے سارے دائروں یعنی قومی آمدنی، زراعت، صنعت، تجارت، قیمتوں کا توازن، بیرونی قرضوں کا بوجھ، افراطِ زر کا بڑے علمی انداز میں جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے اس جائزہ کا قابل قدر پہلو یہ ہے کہ انہوں نے

جو بات بھی کہی ہے وہ اعداد و شمار کی زبان میں کہی ہے، اور اعداد و شمار بھی وہ جو حکومت وقتاً فوقتاً شائع کرتی رہتی ہے۔ اس بنا پر اس کتاب کے جائزے کو اپوزیشن کا گمراہ کن پراپیگنڈا کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں تاکہ جو لوگ پاکستان کی کشتی میں سوار ہیں انہیں معلوم ہو سکے کہ ان کی اس کشتی کو کھینے والے انہیں کس طرف لے جا رہے ہیں۔

کتاب کا معیار طباعت اور کتابت نہایت اعلیٰ ہے اور قیمت بالکل مناسب۔

اقبال اور انجمن حمایت اسلام تالیف: محمد حنیف شاہد صاحب ایم اے۔

شائع کردہ: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام۔ ریلوے روڈ، لاہور۔

ضخامت: ۱۹۶ صفحات

قیمت: -/۲۵ روپے

زیر تبصرہ کتاب علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی انجمن حمایت اسلام کے ساتھ ناچیات وابستگی کا روزنامچہ ہے۔ فاضل مصنف نے سب سے پہلے تو انجمن حمایت اسلام کی تاسیس، اس کے پس منظر اور اس کی ملی خدمات کو جچے تلے الفاظ میں بیان کیا ہے اور پھر اس انجمن کے ایک خاص نہج پر ارتقاء کے باب میں علامہ اقبال کے مؤثر کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ یوں تو پوری کتاب بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے لیکن اس میں دو باتیں خصوصی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ ایک ڈاکٹر اقبال کا مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین کے بارے میں خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو علامہ مرحوم اور بعض دوسرے اراکین کی تحریک پر انجمن سے اس لیے نکال دیا گیا کہ اس کا تعلق عقیدہ ختم نبوت کے منکرین سے تھا۔ اس فیصلے پر علامہ اقبال اور انجمن حمایت اسلام کے خلاف اس گروہ نے جو ہرزہ سرائی کی اس کا کچھ اندازہ لانے کے ایک اقتباس سے ہوسکتا ہے۔

"ایک بہترین صبح کو ڈاکٹر محمد اقبال نے یہ خیال کیا کہ مرزا یعقوب بیگ کافر ہے چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے انجمن حمایت اسلام کو چیلنج بھیج دیا کہ مرزا یعقوب بیگ کو الگ کر دیا جائے جیسا کہ وہ اس احسان فراموش اور بے ضمیر کتوں کی جماعت میں بوجہ اپنی شرافت کے رہنے کے قابل نہ تھا۔ خدا نے اس کو اپنی طرف بلا لیا۔

ہم ڈاکٹر محمد اقبال اور اس کے رہزن گروہ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اب گندہ آدمی اس دنیا میں نہیں رہا اور ڈاکٹر صاحب انجمن کی کرسی صدارت کو زینت بخشیں۔" ص ۱۳۲

قادیانیوں کے بارے میں ڈاکٹر اقبال کی رائے اور طرز عمل کے علاوہ اس کتاب میں دوسری قابل قدر چیز مرحوم کا وہ تاریخی خط ہے جو انہوں نے روزنامہ زمیندار کے مدیر کے نام ترک موالات اور اسلامیہ کالج کے یونیورسٹی سے الحاق کے بارے میں تحریر فرمایا۔ یہ خط آج تک کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوا اور اس کے ذریعے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سیاست کو دین کے تابع رکھنے کے لیے کتنے فکرمند تھے۔ یہ خط طویل اور فکر انگیز ہے اور ڈاکٹر اقبال کے دینی خلوص کا آئینہ دار ہے۔ یہاں ہم اس کے دو اقتباسات نقل کرتے ہیں،

"میں ہمیشہ ہر معاملے کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں اور جب تک کسی امر پر پورا پورا غور و خوض نہیں کر لیتا قطعی رائے قائم نہیں کرتا۔ میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ آج شریعت کے احکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں ان کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے بالکل تباہ ہو جائے گی۔" ص ۹۷

"ہم مذہب کو تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں اور علمائے کرام کو اپنا حکم سمجھتے ہیں۔ جمعیت علمائے ہند جو کچھ فیصلہ کرے گی وہی ہماری رائے ہے۔ ہم اسلام پر سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔" ص ۹۸

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالات حاضرہ محض ایک سیاسی مفہوم رکھتے ہیں اور پختہ کارانِ سیاست ہی اس کے فیصلہ کے اہل ہیں اور مسند نشینانِ پیغمبر کو ان حالات سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ میری رائے میں ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں جو حقائق و تاریخ اسلامیہ اور شریعت حقہ کے مقاصد نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس پر فقہائے اسلام نے حیرت انگیز چھان بین نہ کی ہو۔" ص ۱۰۲

کتاب کو جناب حنیف شاہد صاحب نے بڑی محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے اور انجمن حمایت اسلام نے اسے نہایت عمدہ معیار پر شائع کیا ہے۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مستند اور قابل قدر اور اقبال کی صد سالہ تقریبات کے لیے فاضل مصنف اور انجمن حمایت اسلام کی طرف سے نہایت موزوں تحفہ ہے۔

(بقیہ اشارات) اُس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں انہیں وہ ادا کرنے سے گریز کرے یا عوام جن مراعات کے مستحق ہیں اُنہیں دینے سے انکار کرے یا عوام کو جو حقوق اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ہیں اُنہیں مختلف حیلوں بہانوں یا ظالمانہ ہتھکنڈوں سے سلب کرے، یا معاشرے کے مختلف طبقات میں منافرت پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے کے خلاف لڑائے اور اس طرح معاشرے کی اجتماعی قوت کو کمزور کر کے عوام پر اپنی گرفت مضبوط کرے۔

حضرت عمروؓ بن مُرّہ نے ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ میں نے حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد خود اپنے کانوں سے سُنا: جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے معاملات کا والی بنائے اور وہ اُن کی احتیاج اور افلاس دُور کرنے سے اغماض برتے تو اللہ تعالیٰ (قیامت کے روز) اُس کی احتیاج، اُس کی ضرورت اور اُس کے افلاس سے منہ پھیر لے گا۔

ایک مرتبہ ہشام بن حکیمؓ شام کے بازار میں سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے چند افراد کو دھوپ میں کھڑے دیکھا۔ اُنہوں نے جب اس معاملہ کی حقیقت دریافت کی تو انہیں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے چونکہ جزیہ ادا نہیں کیا اس لیے انہیں سزا کے طور پر دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے۔ اس پر ہشام نے کہا: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا: اللہ ان لوگوں پر عذاب مسلط کرے گا جو عوام کو عذاب میں مبتلا کرتے ہیں۔ (مسلم کتاب البرّ والصِّلۃ)

عذاب صرف یہی نہیں کہ عوام سے ٹیکس وصول کرنے میں سختی کی جائے بلکہ اُن پر ناجائز اور کمر توڑ ٹیکس کا بوجھ لادنا بھی عذاب کی بدترین صورت ہے۔ ابوداؤد، احمد اور دارمی نے عقبہؓ بن عامر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا "صاحب مکس" یعنی وہ شخص جو ظلم و جور کے ذریعے لوگوں سے ٹیکس وصول کرتا ہے۔

حضرت بُریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو ہم نے عامل مقرر کیا اس کا رزق مقرر کر دیا۔ اس کے بعد جو شخص (اپنے حق سے زیادہ) وصول کرتا ہے وہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے (ابوداؤد)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا۔

جب میں روانہ ہوا تو کسی کو مجھے آواز دے کر واپس بلانے کے لیے کہا۔ چنانچہ میں پھر حاضر ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا: کیا تمھیں معلوم ہے میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ تمہیں یہ بات بتا دوں کہ بغیر حق کے کسی سے کوئی چیز نہ لینا۔ اس کے بعد فرمایا: اب تم جا سکتے ہو (ترمذی)

کسی ملک میں ناجائز ٹیکسوں کی بھرمار کا سلسلہ عام طور پر اس وقت شروع ہوتا ہے جب اقتدار کے تخت پر عیاش لوگ قابض ہو کر دادِ عیش دینا شروع کر دیتے ہیں۔ عوام کے اندر بھی ان محاصل کے خلاف نفرت کے جذبات اُسی صورت میں اُبھرتے ہیں جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے خون پسینہ کی کمائی برسرِاقتدار طبقہ اپنی عیاشیوں اور اپنے شاہانہ ٹھاٹھ پر بے دریغ خرچ کر رہا ہے۔ اگر عوام کو اس بات کا یقین ہو کہ اُن کے حکمران اُن سے جو ٹیکس وصول کرتے ہیں انہیں پوری احساس ذمہ داری کے ساتھ اُن کی بھلائی پر ہی خرچ کر رہے ہیں تو ان کے بوجھ کو بخوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حاکم اور محکوم دونوں کی جائز ضروریات کا خود تعین کر دیا ہے تاکہ نہ حاکم لوگوں کی جان جوکھوں کی کمائی کو اپنے تعیشات پر خرچ کریں اور نہ عوام زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم رہیں۔ راعی اور رعیت دونوں کو اپنے اپنے حقوق کا پورا پورا شعور رہو۔ حاکم اگر اپنے جائز حق سے زیادہ کا مطالبہ کریں تو عوام اُن کے اس مطالبہ کو مسترد کر سکیں اور رعایا کو اگر اُن کا صحیح حق نہ مل رہا ہو تو وہ حکمرانوں سے اس کا تقاضا کر سکیں۔

حضرت المستورد بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔

> جو شخص ہمارا عامل مقرر ہوا اُس کا یہ حق ہے کہ وہ ایک بیوی حاصل کرے۔ اگر اس کے خادم نہیں تو خادم لے لے۔ اور اس کے پاس رہائش گاہ نہیں تو رہائش گاہ حاصل کرے اور جس نے اس کے علاوہ کچھ حاصل کیا وہ خائن ہے۔ (ابوداؤد)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جس زہد، تقویٰ اور احساس ذمہ داری کے ساتھ خلافت کی گراں بار ذمہ داریوں کو سنبھالا اُس سے تاریخ کے صفحات مزین ہیں۔ وہ نہ صرف خود عوام کے حقوق کے معاملے میں غیر معمولی حساس تھے بلکہ اپنے عاملوں کی بھی اسی نہج پر تربیت کرنے کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ چنانچہ جس وقت کسی شخص کو کسی علاقے کا نگران بنا کر بھیجتے تو اُس پر یہ شرائط عائد کرتے:

نہ کسی بیش قیمت گھوڑے پر سواری کرنے سے اجتناب کرو گے، نہ تو تم میدہ کی روٹی کھاؤ گے اور نہ باریک لباس زیب تن کرو گے اور ضرورت مندوں پر اپنے دروازے بند نہ کرو گے۔ اگر تم نے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی کی تو تم نے دنیا اور آخرت کے عذاب کو دعوت دی۔ (البیہقی، شعب الایمان)

یہ تو ہیں مسلمان حکمرانوں کی وہ ضروریات جنہیں اسلام نے ان کے جائز حقوق کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور جن کا فراہم کرنا اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دین حق نے مسلمان فرمانرواؤں پر بھی یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ عوام کی جائز معاشی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھیں۔ حضرت عبدالرحمٰنؒ بن شماسہ سے روایت ہے:

میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں کچھ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا تو آپؓ نے فرمایا: تو کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے؟ تو میں نے عرض کیا، مصر سے۔ اس پر آپؓ نے دریافت فرمایا تمہارے حاکم کا کیا حال ہے اس لڑائی میں (یعنی محمد بن ابی بکر کا جنہیں حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ نے قیسؓ بن سعد کو معزول کر کے مصر کا حاکم بنایا تھا) میں نے عرض کی: ہم نے ان میں کوئی ناپسندیدہ بات نہیں دیکھی۔ ہم میں سے اگر کسی شخص کا اونٹ مر جاتا ہے تو وہ اس کی جگہ اونٹ دے دیتے ہیں۔ اگر اسے کھانے پینے کی احتیاج ہو تو وہ اس کی یہ احتیاج پوری کر دیتے ہیں (مسلم)

اس ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک مکتوب جسے اسلام کے اصول حکمرانی کا مغز کہا جا سکتا ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

حضرت ابوعثمان سے روایت ہے کہ خلیفہ دوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہم کو آذربیجان میں یہ خط بطور ہدایت تحریر کیا:

عُتبہ بن فرقد!

جو مال تیرے پاس ہے وہ نہ تیرا کمایا ہوا ہے اور نہ تیرے باپ کی محنت کا نتیجہ ہے اور نہ تیری ماں کی مشقت کا ثمرہ۔ اس لیے اسے مسلمانوں کی حاجت پر آدمی کے لیے اس کے ٹھکانوں پر جا کر فیاضی سے خرچ کر (یعنی ان کے دستِ سوال دراز کیے بغیر) ان کی احتیاجات پوری کر۔ عیش و عشرت کی زندگی اور اہل شرک کے ٹھاٹھ باٹھ سے بچو، ریشمی لباس زیب تن کرنے سے سخت پرہیز کرو کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی لباس پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم، کتاب اللباس والزینۃ)

اب ایک نظر مسلمان حکمرانوں کو اسلام نے جو مراعات دی ہیں اور رعایا کے معاملے میں انہیں جن فرائض کا پابند کیا گیا ہے انہیں ملاحظہ فرمائیں اور پھر یہ دیکھیں کہ دورِ جدید میں اسلام کے علمبردار فرمانروا مراعات، بلکہ ناجائز مراعات کے حصول میں کس قدر حریص ہیں اور اپنے فرائض ادا کرنے میں کس قدر مجرمانہ تغافل سے کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حاکم و محکوم کے مابین محبت اور اخوت کے رشتے استوار ہونے کے بجائے نفرت اور حقارت کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں اور تعاون کے بجائے باہم تصادم کی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے حکمرانوں اور بُرے حکمرانوں کی بعض واضح نشانیاں بتائی ہیں۔ حضرت عوف بن مالک الاشجعی سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا:

خیارُ ائمتکم الذین تحبونہم ویحبونکم، وتصلون علیہم ویصلون علیکم۔ وشرار ائمتکم الذین تبغضونہم ویبغضونکم، وتلعنونہم ویلعنونکم۔ (مسلم۔ کتاب الامارۃ)	تمہارے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ تم اُن کے حق میں دُعا کرو اور وہ تمہارے حق میں دعا کریں۔ اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں۔ تم اُن پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔

اچھے اور بُرے حکمرانوں کی دوسری نشانی یہ ہے کہ خیر اور بھلائی کے طالب حکمران اپنے مشیر خدا ترس لوگوں میں سے منتخب کرکے ان کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں جب کہ بُرائی کے رسیا اور اسے فروغ دینے کے خواہشمند اصحابِ اقتدار اپنی مشاورت کے لیے معاشرے کے بدترین لوگ چُنتے ہیں اور ان کے غلط مشوروں پر چل کر خود بھی برباد ہوتے ہیں اور قوم کو بھی ہلاکت کی راہ پر ڈالتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جب اللہ تعالیٰ کسی حکمران کے بارے میں بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حق پرست اور حق گو مشیر فراہم کر دیتا ہے جو اگر (امیر اپنے فرائض سے) غافل ہوجائے تو اُسے یاد دلاتے ہیں اور (جب انہیں یاد آجائیں تو ان کے سرانجام دینے میں اس کی عملی معاونت کرتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے برعکس کوئی ارادہ کرتا ہے تو (برائی کے علمبردار حکمران کے لیے بُرے مشیر فراہم کرتا ہے جو (حکمران کی غفلت پر) اسے متنبہ نہیں کرتے اور اگر حکمران کو (اپنی ذمہ داریوں) کا کچھ احساس ہونے لگے تو وہ اس کی معاونت کرنے سے پہلوتہی کرتے ہیں (ابوداؤد، نسائی)۔